"اے اللہ میں آپ سے اس علم کی پناہ مانگتا ہوں
جو نفع بخش نہ ہو۔" (مسلم)
OMEGA SUPER HARDWARE
Complete range of Latest fittings for Doors & Windows, Bath Rooms and Furnitures, Glass Furnitures
AD 5/2, 2nd AVENUE, ANNA NAGAR, CHENNAI- 40.
Phones: 2620 2016,4269 0216

"اس شخص سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔" (قرآن)

سہ روزہ
دعوت
نئی دہلی
www.dawatonline.com

"قرآن سمجھئے آسان طریقہ سے"
تالیف ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالرحیم
انتہائی سادہ اور موثر طریقہ، جس میں آپ قرآن مجید کے تقریباً 300 الفاظ سیکھیں گے جو قرآن میں 55,000 بار آئے ہیں (یعنی 70 فیصد الفاظ) انشاء اللہ صرف 25 منٹ کی روزانہ کوشش اگلے دو مہینے میں آپ کی قرآن فہمی کے خواب کو سچ کر نا شروع کر دے گی۔
قیمت: 220/- Set
ملنے کا پتہ
اسلامی کتابوں کی دنیا
ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس
455- پرانی حویلی، حیدرآباد-2 انڈیا
Ph : 040-24514892, 66481637
E-mail:hudabook@yahoo.com

● جلد: ۵۷ ● شمارہ: ۵۴ ● ۱۳؍جون ۲۰۰۹ء ● 13 June 2009 ● شنبہ ● ۱۹؍جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ ● قیمت= Rs.5/ ● سعودی عرب اور دیگر خلیجی ملکوں کیلئے ۳؍ریال ● Posting: 11 June 2009 Thursday

اسرائیل امن کا خواہاں/ نیتن یاہو

بیت المقدس۔ اسرائیلی وزیراعظم بنجامن نیتن یاہو نے کہا ہے کہ اسرائیل فلسطین کے ساتھ امن چاہتا ہے۔ کابینہ کے اجلاس میں انھوں نے کہا کہ وہ آئندہ ہفتے مشرق وسطیٰ میں امن اور امریکہ سے تعلقات کے حوالے سے پالیسی کا اعلان کریں گے۔ ادھر اسرائیلی وزیر دفاع ایہود براک نے کہا کہ امریکہ سے اختلافات کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان تعلقات خوشگوار رہیں گے۔

اسرائیل کیخلاف مقدمات کی تیاری

غزہ۔ غزہ میں جنگی جرائم پر اسرائیل کے خلاف سیکڑوں مقدمات دائر کرنے کی تیاری کی گئی ہے۔ فلسطینی ہیومن رائٹس کے سربراہ ایاز علامی نے کہا کہ غزہ میں اسرائیل کے جنگی جرائم کے حوالے سے وکلاء نے ۹۳۶ درخواستیں تیار کی ہیں جنھیں اسپین کی عدالت میں دائر کیا جائے گا۔ ایاز علامی کے مطابق ان کے ادارے کا لیگل ڈپارٹمنٹ غزہ میں نہتے شہریوں کے قتل، بچوں کو قریب سے گولیاں مارنے، سفید فاسفورس کے استعمال، ایمبولینسوں پر حملوں اور شہریوں کے گھروں کو تباہ کرنے کے شواہد جمع کر رہا ہے۔

اسرائیلی حکومت بدعنوان/ سروے

تل ابیب۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق اسرائیلی عوام نے اپنی حکومت کو بدعنوان ترین قرار دیا ہے۔ حال ہی میں اقتدار میں آئے بنجامن نیتن یاہو کی حکومت کے بارے میں ۸۶ فیصد عوام کا کہنا ہے کہ بدعنوانی کے خلاف حکومت کے اقدامات غیر موثر ہیں۔ اسرائیلی اخبار ہرٹز کے مطابق وزیر خارجہ اے وگڈور لابرمین سمیت متعدد اعلیٰ حکومتی عہدیدار مالی بدعنوانی کے الزامات کا سامنا کر رہے ہیں۔

امریکہ خلوص کا مظاہرہ کرے/ متوکل

کابل۔ افغانستان میں طالبان کے سابق وزیر خارجہ وکیل احمد متوکل نے کہا ہے کہ امریکہ کو فلسطین، عراق اور افغانستان کے مسائل کے حل کے لئے خلوص نیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اصل مسئلہ امریکہ اور اسلام کے درمیان محاذ آرائی کا نہیں ہے بلکہ فلسطین، عراق اور افغانستان کے مسائل پر امریکی پالیسی کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ افغان عوام کو آزادی ملنی چاہئے اور افغان عوام کی آزادی امریکہ کے لئے ایک ٹیسٹ کیس ہے۔

ایران اور اسرائیل کی تیاری

تہران۔ ایران نے زمین سے فضا میں مار کرنے والے شاہین میزائلوں کی ملکی سطح پر تیاری کا آغاز کر دیا ہے۔ ایرانی وزیر دفاع مصطفیٰ محمد نجار نے کہا کہ یہ جدید ترین اور ہائی ٹیک میزائل ہے۔ کسی ممکنہ حملے کی صورت میں یہ نظام ایران کے فضائی دفاعی نظام کی صلاحیتوں میں اضافہ کردے گا۔ ادھر اسرائیل نے بھی ٹینکوں کو جنگوں کے دوران اینٹی ٹینک میزائلوں سے بچانے کے لئے اپ گریڈ کرنے کا اعلان کیا ہے۔

افغانستان میں امریکی سرگرمیوں کی رپورٹیں

نیویارک۔ افغانستان میں امریکی فوج نے مشہور ویب سائٹ ٹیوٹر کے استعمال سے ابلاغی جنگ کا ایک نیا محاذ کھول دیا ہے۔ عہدیداروں کا کہنا ہے کہ انفارمیشن سے متعلق اس نئی کوشش کا مقصد ان لوگوں تک پہنچنا ہے جو غیر روایتی ذرائع ابلاغ سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ یہ طالبان کے پروپگنڈے کے توڑ کی ایک حکمت عملی ہے۔ ٹیوٹر ایک سماجی میٹنگ ویب سائٹ ہے جو لوگوں کو اپنی سرگرمیوں سے متعلق مختصر اپ ڈیٹ یا ٹیوٹیٹر کے اندراج کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ اس میں امریکہ اپنی جنگی کارروائیوں اور اپنے فوجیوں کی ہلاکت کی خبریں دیتا ہے۔ افغان شہریوں کی ہلاکت کی خبریں نہیں دیتا ہے۔ اس سے پہلے امریکہ فیس بک پیج استعمال کرتا تھا۔

نئی نسلوں کا مستقبل روشن بنانے کیلئے ہر طبقہ کو ذمہ داری نبھانے کی ضرورت ہے

بورڈ کے امتحانات میں سدھار اور بہتری کا اثر یوپی بورڈ کے نتائج میں بھی دیکھنے کو ملا تاہم نتائج کو پوری طرح قابل اطمینان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس سال انٹرمیڈیٹ میں ۹،۵۲ء۷ فیصدی اور ہائی اسکول میں ۶۷،۵۶ء فیصدی اسٹوڈنٹ پاس ہوئے۔ اس سلسلے میں جہاں ہر طرف سے طلباء وطالبات ہی کے سر کامیابی اور ناکامی کی ذمہ داری ڈالی جاتی ہے، ذرا گہرائی میں جاکر حکومت کے ذمہ داروں، وزارت تعلیمات کی پالیسیوں، ریاستی اور ضلعی سطح پر محکمہ تعلیم کے افسروں، اسکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ، پرنسپل صاحبان اور ٹیچرس، بچوں کے والدین اور سرپرستوں نیز معاشرہ وسوسائٹی کے رول کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو کو مادری زبان ماننے والوں کے سلسلے میں بھی اوپر سے نیچے تک مذکورہ بالا تمام طبقات وذمہ داران کے بارے میں کھلے دل ودماغ کے ساتھ تمام تنگ نظریوں سے بالاتر ہوکر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ حکمراں، ملک کے مستقبل کے ذمہ دار، آنے والی نسلوں کی زندگیوں کے بارے میں اپنی فکر وسوچ اور مفادات کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں۔ کوئی نقل کی کھلی چھوٹ دے دیتا ہے تو کوئی امتحانات کے دوران غلط حرکات سرزد ہونے پر جیل تک بھیج دینے کا آرڈر جاری کر دیتا ہے۔ ٹیچروں کو تعلیم وتدریس سے زیادہ غیر تدریسی سرگرمیوں اور ذاتی مصروفیات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ سرکاری ایڈ سے چلنے والے اسکولوں کی انتظامیہ کا صرف مینجنگ کمیٹیوں کے عہدے حاصل کرنے اور "اپنوں" کو سہولتیں فراہم کرانے پر زور ہوتا ہے۔ وزارت تعلیم کے افسروں اور ملازموں کا بھی دھیان تعلیمی حالت کو بہتر بنانے سے زیادہ غیر تعلیمی کاموں پر مرکوز ہوتا ہے۔ ضلعی سطح پر محکمہ تعلیم افسروں کو بھی اسکولوں اور کالجوں کا معائنہ کرنے اور ان کی حالت بہتر بنانے سے متعلق امور پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ بچوں کے والدین اور سرپرستوں تک کو اپنے بچوں کے مستقبل کو روشن اور یقینی بنانے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی اسکولوں میں جاکر بچوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں ٹیچروں سے بات نہیں کرتے۔ نہ بچوں کو درپیش مسائل کے حل کی فکر کرتے ہیں نہ ان کی آوارگی، کلاسوں سے غیر حاضری اور ٹیچروں کے ساتھ بدسلوکی کے بارے میں کوئی خیر خبر لیتے ہیں۔ معاشرہ وسوسائٹی سے تو انسانی اقدار، انس وانسیت ہی مفقود ہورہی ہیں۔ طلباء وطالبات کی کیا ضرورتیں ہیں۔ انہیں یکسوئی کے ساتھ تعلیم پر توجہ دینے کے کتنے مواقع ہیں۔ درسی اور غیر درسی مطالعہ کی کتنی سہولتیں ہیں۔ اسکول، کالجوں میں لائبریریوں کی کیا صورتحال ہے۔ محلوں، بستیوں میں دارالمطالعہ اور گائیڈ سنٹروں، کوچنگ سنٹروں کی کس قدر افادیت ہے۔ گورنمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین اور وقتاً فوقتاً ہونے والے تذکروں کے باوجود اس طرف کسی کا دھیان نہیں ہے۔ یقینی بات ہے بچے تو بچے ہوتے ہیں بچپن اور نوعمری میں سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس دور اندیش کم ہی ہوتے ہیں۔ کھیل، تفریح، من موجی پن پر زیادہ زور ہوتا ہے، انہیں روک ٹوک، دیکھ بھال، نگرانی، تربیت اور گائیڈینس ورہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدرت تمام جانداروں کو ماں باپ کے ذریعے پیدا کرتی ہے۔ مختلف جانداروں کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے ماں باپ پر انحصار کے مرحلے ہوتے ہیں۔ مچھلی کے بچے پیدا ہوتے ہی انحصار سے آزاد ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مچھلی جانے کن تیرن سکھائے۔ مچھلی نہ انڈے سیتی ہے نہ بچوں کو کھلانے پلانے کی فکر کرتی ہے اور نہ ہی تیرنا سکھاتی ہے۔ مرغی کے چوزے بھی انڈوں سے باہر آتے ہی چگنا خود شروع کر دیتے ہیں تاہم ان کی ماں چیل کوؤں اور کتے بلی سے ان کی حفاظت کرتی ہے۔ چوپائے ایک مدت تک اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں جن پرندوں کے بچے بے بال وپر پیدا ہوتے ہیں وہ بال وپر نکلنے اور بچوں کے قابل پرواز ہونے تک دانہ دانہ چن کر لاتے اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان سب جانداروں کی زندگیاں محدود ہیں۔ زندگی کی سرگرمیاں محدود ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں اور مصروفیتیں محدود ہیں۔ انسان کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہیں۔ اس کی زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انسان صرف اپنے ہی لئے نہیں اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات کے لئے بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ وہ خالق کائنات رب السماوات والارض کا خلیفہ ہے۔ دوسری مخلوقات پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ مخلوقات اس کیلئے مسخر کی گئی ہیں۔ انسان ان سے کام لیتا ہے ان کے ذریعے اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ ان سے فائدے اٹھاتا ہے خود ان کے بھی بہت کام آتا ہے، انہیں کنٹرول بھی کرتا ہے، ان کے کھانے پینے رہنے کا بندوبست بھی کرتا ہے۔ وہ زمین کا سینہ چیرتا ہے، آسمانوں میں اڑتا پھرتا ہے، سمندروں کو بھی مسخر کرتا ہے، نئی نئی اشیاء ایجاد کرتا ہے۔ ان سب کاموں کے لئے اس کی تعلیم وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقوق وفرائض اس کے ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے بچہ کا طویل مدت تک اس کے ماں باپ پر انحصار قائم کیا ہے۔ اس کے لئے اعزا واقربا، رشتے داروں، پڑوسیوں، سرپرستوں اور اہل خاندان کا ایک وسیع وعریض نظام تشکیل دیا ہے۔ اس کو معاشرہ اور سوسائٹی سے مربوط کیا ہے۔ بچے کے تئیں ان سب کی ذمہ داریاں مقرر کی ہیں۔ بڑے ہونے پر بھی ایک دوسرے پر حقوق و فرائض عائد کئے ہیں۔ ان حقوق وفرائض کی ادائیگی کا پابند بنایا ہے۔ جوابدہ قرار دیا ہے۔ اسے اچھے برے کے شعور کی نعمت سے نوازا ہے اور اچھائی وبرائی پر جزا وسزا کا نظام تشکیل دیا ہے۔

بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے ہر ایک پر حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں۔ نہ صرف ان کے پاس اور فیل ہونے پر نظر رکھنی ضروری ہے بلکہ بحیثیت انسان ان کی اقتصادی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی، مذہبی، ہر شعبۂ زندگی میں فلاح وکامیابی کے سلسلے میں ان کی فکر کرنا، رہنمائی کرنا، نگہداشت کرنا ضروری ہے۔ یوپی بورڈ کے نتائج اس سال گزشتہ سال کے مقابلے میں بہتر رہے ہیں کہ گزشتہ سال کے مقابلے میں انٹرمیڈیٹ کا پندرہ فیصد اور ہائی اسکول کا سولہ فیصد نتیجہ بہتر رہا یعنی گزشتہ سال انٹرمیڈیٹ کے تقریباً ۶۴ فیصد طلباء و طالبات پاس اور ۳۶ فیصد فیل ہوئے تھے۔ ہائی اسکول میں ۵۰،۳۴ فیصد پاس اور ۶۵ فیصد ناکام یا فیل ہوئے تھے۔ ظاہر ہے فیل ہونے والوں کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ وہ علم کی دولت سے حاصل ہونے والے منافع وفوائد سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اس بار بھی انٹرمیڈیٹ کے بیس فیصد سے زیادہ اور ہائی اسکول کے ۳۳،۴۳ فیصد نوجوانوں کی بدقسمتی پر مہر لگی ہے جبکہ انسانیت کے ہر طبقہ کو ان کے تئیں اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض حقوق کی فکر کرنی چاہئے کہ سب کو آخر ایک دن جواب اور حساب دینا ہے۔

(ع ق)

امریکہ کا ناقابل فہم رویہ

پاکستان کے سلسلے میں امریکہ کے رویے کو کوئی نام دینا ایک مشکل امر ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف تو امریکہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے۔ کبھی امریکی لیڈر اسے بدقماش ریاست بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی امریکہ سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ پاکستان دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک ملک ہے اس لئے کہ دنیا کے انتہائی خوفناک دہشت گردوں نے پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے اور پاکستانی ریاست امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کو ان کے خلاف آزادانہ طور پر کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان نے تباہ کن ہتھیاروں کا جو ذخیرہ کر رکھا ہے وہ غیر محفوظ ہے کیونکہ پاکستان میں انتہا پسندی نہ صرف بڑھ رہی ہے بلکہ پاکستان پر اس کا راج ہے۔ انتہا پسند اس قدر مضبوط ہوگئے ہیں کہ اس کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ کہیں وہ جوہری اثاثوں پر قابض نہ ہوجائیں۔ امریکہ پاکستان کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں ماہرین کا ایک ایسا ٹولہ پایا جاتا ہے جس کے سربراہ جوہری سائنسداں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ہیں، جن کے انتہا پسندوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ گہرے روابط ہیں بلکہ وہ انہیں اہم راز بھی دے رہے ہیں یا دینے پر آمادہ ہیں۔ امریکہ میں یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ اس ٹولے نے جوہری ٹیکنالوجی دوسرے ملکوں کو دی ہے جن میں ایران، شمالی کوریا، لیبیا اور بعض دوسرے ملکوں کا نام لیا جاتا ہے۔ حکومت پاکستان اس ٹولے کو تحفظ فراہم کر رہی ہے۔ وہاں کی سول حکومت بھی ایسا کرنے پر اس لئے مجبور ہے کیونکہ پاکستانی فوج یہی چاہتی ہے۔ پاکستانی فوج کے بارے میں ایک زمانے میں امریکہ بدقماش فوج کی اصطلاح بھی استعمال کرتا رہا ہے۔ آج بھی امریکی اعلیٰ دماغوں کا ایک موثر طبقہ یہی سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ پاکستانی فوج کے طالبان کے ساتھ روابط ہیں اور فوج کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو طالبان کے تئیں ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ پاکستان کی انٹلیجنس تنظیم آئی ایس آئی کے بارے میں تو امریکی یہ کہتے ہیں کہ بس کی گانٹھ اصل میں یہی ہے۔ اس نے پوری دنیا میں دہشت گردی کو پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان پر وہ ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کا الزام بھی لگاتے رہے ہیں۔ پاکستان کے جوہری اسلحہ کو خطرناک بھی قرار دیتے رہے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں امریکی لیڈروں، دانشوروں اور اعلیٰ دماغوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ اس کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ وہ امریکہ اور ڈونر ملکوں کو دھوکہ دیتا چلا آرہا ہے۔ پاکستانی حکمراں خواہ وہ سول حکمراں ہوں یا فوجی اعلیٰ افسران دوہرا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے نام پر عالمی برادری سے مالی تعاون حاصل کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف انھوں نے دہشت گردی اور انتہا پسندوں کی سرپرستی بھی جاری رکھی ہے۔ بعض پاکستانی لیڈروں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ امریکیوں کا ان کے اور پاکستانی ریاست کے بارے میں یہی خیال ہے۔ اب پچھلے کچھ دنوں سے امریکہ کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ امریکہ پاکستان کی جو مالی امداد دیتا رہا ہے پاکستان نے اس کو غلط جگہ خرچ کرتا رہا ہے، یعنی اگر امریکہ نے پاکستان کو عوامی سہولتوں کو بہتر بنانے کے نام پر رقم دی تو پاکستان نے اس کا اسلحہ خرید لیا، پنٹاگون کی طرف سے جاری کی گئی ایک رپورٹ میں اس کی شکایت کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ امریکہ نے ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۹ء کے دوران جتنی بھی امدادی رقم دی ہے اس کو ان مقاصد کے لئے استعمال نہ کرکے دوسرے امور پر اور خاص طور پر فوجی ساز وسامان کی خریداری پر خرچ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ دور امریکہ میں جارج ڈبلیو بش کا اور پاکستان میں باوردی صدر جنرل پرویز مشرف کا دور ہے۔ یہ کوئی نئی بات یا کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔ بہت پہلے سے یہ باتیں کہی جاتی رہی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود نئی امریکی انتظامیہ نے بھی سابق صدر جارج ڈبلیو بش کی پالیسی کو ہی آگے بڑھایا ہے۔

یاد رہے کہ صدر بش نے دہشت گردی کے خلاف اپنے عالمی جنگ میں پاکستان کو ایک مضبوط اتحادی بنا رکھا تھا اور اس کے نام پر پاکستان کی فوجی اور غیر فوجی امداد جاری رکھی تھی۔ اب اوباما انتظامیہ نے بھی دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کی جو مہم چھیڑی ہے اس میں پاکستان کو ایک کلیدی کردار قرار دیا ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ پاکستان کے بغیر امریکہ اس مہم کو سر کر ہی نہیں سکتا نہ وہ دہشت گردی کی سرکوبی میں کامیاب ہوسکتا ہے، یہی نہیں بلکہ پاکستان کے لئے مالی امداد کا منھ کھول رکھا ہے اور نئے نئے نام پر امداد دی جارہی ہے۔ پاکستان کے تئیں امریکہ کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے، یہ بات بہتوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ (ش ر)

بلا تبصرہ

مسز میرا کمار کے انتخاب کا سب سے بڑا محرک اور سب سے بڑی وجہ ان کا عورت ہونا ہے، علاوہ ازیں کانگریس یہ بھی چاہتی تھی کہ بی ایس پی دلتوں کی تنہا مسیحا نہ رہے اور مایاوتی کے پاس یہ جو حربہ ہے ان سے چھین لیا جائے۔ اس کے لئے میرا کمار سے بہتر کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک بڑے دلت لیڈر جگ جیون رام کی بیٹی ہیں، کانگریس اس کے ذریعے دلتوں کو یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ عورتوں کی بھی خیر خواہ ہونے کے ساتھ ساتھ دلتوں کی بھی خیر خواہ ہے۔

گور کشور گانگولی، کولکاتہ
اسٹیٹس مین، ۸؍جون ۲۰۰۹ء

خبر ونظر

زندہ انسانوں کی زندہ جماعت

مجلس نمائندگان، جماعت اسلامی ہند کی سب سے اعلیٰ اختیاراتی مجلس ہے۔ امیر جماعت اور ان کی مجلس شوریٰ کا انتخاب یہی مجلس کرتی ہے، بوقت ضرورت انہیں معزول بھی کر سکتی ہے۔ اس مجلس کا انتخاب ہر چار سال بعد ہوتا ہے، ہر دو سال بعد اس کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس میں ۱۲۸ ارکان ہیں۔ مئی کے آخری چار دنوں میں مجلس کا اجلاس جنوبی ہند کے مشہور شہر بنگلور میں ہوا۔ اس میں شرکت کا موقع ملا۔ مجلس کے اجلاس میں یہ پہلی شرکت تھی۔ تحریک اسلامی کے ساتھ قدیم وابستگی کی وجہ سے اس کے داخلی نظام، اس کے اسلامی شورائی مزاج، فیصلوں کے طریقوں اور رفقائے جماعت کے باہم مباحث اور ان کے اسلوب سے واقفیت پہلے ہی سے تھی اور بخوبی تھی۔ کُل ہند اجتماعات کے علاوہ مختلف سطحوں کے اجتماعات میں شرکت ہوتی رہی تھی، مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی نشستوں میں شرکت اور اظہار خیال کے مواقع بھی ملتے رہے۔ مسائل میں اختلافات اور بعض اوقات تلخ گفتگو کے تجربات ومشاہدات بھی ہوئے۔ مجلس نمائندگان کے مباحث کی رپورٹیں بھی ملتی رہی تھیں۔ لیکن اس اعلیٰ ترین ادارے کے اجلاس میں عملی شرکت پہلی بار ہوئی تھی۔ بڑا خوشگوار اور امید افزا تجربہ تھا۔

دو مثالیں

مرکزی شوریٰ کی جانب سے ایک تجویز پیش ہوئی جس کا تعلق نظم جماعت سے تھا اور دستور جماعت کی کچھ دفعات کی شقوں میں ترمیم مقصود تھی۔ ضروری بحث ہوچکی تھی، حق میں اور مخالفت میں دلائل آچکے تھے۔ طے پایا کہ رائیں لی جائیں۔ پہلے حق میں ہاتھ اٹھوائے گئے۔ امیر جماعت سمیت اسٹیج پر موجود مرکزی قیادت کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے لیکن آڈیٹوریم میں اٹھنے والے ہاتھوں کی تعداد کم تھی۔ پھر اختلاف رکھنے والوں کے ہاتھ اٹھوائے گئے۔ تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس پر قیم جماعت نصرت علی صاحب نے اعلان کیا "تجویز کثرت رائے سے مسترد ہوگئی ہے"۔ یعنی وہ تجویز مسترد ہوگئی جسے امیر جماعت کی تائید حاصل تھی اور یہ کسی پارٹی کے اندر جمہوریت اور آزادی اظہار خیال کا زریں نمونہ تھا لیکن دراصل یہ اسلام کے شورائی نظام کی ایک جھلک تھی۔۔۔ اب ایک دوسرا منظر۔ کچھ رفقاء نے ایک دستوری سوال اٹھایا جس کا تعلق غیر علاقائی ارکان مجلس کی تعداد میں اضافے سے تھا جس کا فیصلہ گزشتہ اجلاس میں ہوا تھا اور اس پر عمل بھی ہوچکا تھا۔ بحث شروع ہوگئی۔ کچھ دیر بعد امیر جماعت نے مداخلت کی، کہا "میرے خیال میں یہ بحث غیر ضروری ہے۔ یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا اس پر عمل بھی ہوگیا، لہٰذا اس گفتگو کو یہیں ختم ہوجانا چاہئے"۔ ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ بالکل خموشی۔ بحث اس طرح بند ہوئی گویا شروع ہی نہ ہوئی تھی۔ پھر فوراً ہی دوسرے امور زیر غور لائے گئے۔ اور یہ اطاعتِ امیر اور احترام امیر کی ایک مثال تھی۔

وہ منظر روح پرور تھا

لیکن سب سے اہم اور روح پرور منظر وہ تھا جب دستور کی ایک دفعہ کی ضمنی دفعہ میں ترمیم پر بحث شروع ہوئی۔ اس کی تجویز بھی مرکزی شوریٰ کی طرف سے آئی تھی۔ بعض ارکان کے لئے یہ ایک حساس اور نازک مسئلہ تھا۔ امیر جماعت اور قیم جماعت غیر جانبدار تھے البتہ ایوان کی اکثریت اس کے حق میں تھی لہٰذا بھاری اکثریت سے تجویز منظور ہوگئی۔ جو رفقاء اس کے حق میں نہیں تھے، ظاہر ہے کہ انھیں مایوسی ہوئی تھی۔ ایوان پر ایک خاص قسم کی خاموشی چھا گئی تھی۔ لیکن امیر جماعت مولانا سید جلال الدین صاحب عمری کے اختتامی خطاب نے ماحول کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ خطاب تقریباً سانس روک کر سنا جارہا تھا۔ تقریر کا ایک ایک جملہ ہر کسی کے دل میں اتر رہا تھا، لہجہ اور اس کا سوز وگداز ـــ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز، کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ گویا نصیحتیں اور ہدایات سب کے لئے رخت سفر اور زاد راہ تھیں۔ خطاب اور دعا کے بعد کا منظر یہ تھا کہ گویا کسی مسئلہ پر کوئی اختلاف تھا ہی نہیں، کسی چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی نہ کسی چہرے پر شکست خوردگی کا شائبہ۔ ہال سے باہر رفقاء کی باہم گفتگو اور تبادلہ خیالات وتبصروں سے ذرا بھی ظاہر نہ ہوتا تھا کہ ہال کے اندر کسی اختلافی امر پر بحث ہوئی ہے۔ امیر جماعت کا اختتامی خطاب خاص طور سے گفتگو کا موضوع تھا جسے بحیثیت مجموعی پورے اجلاس کا حاصل قرار دیا جارہا تھا۔

جماعت کی تاریخ یہی ہے

جماعت اسلامی ہند کی تاریخ یہی ہے۔ ۶۱ سال کے اس سفر میں جماعت پر کئی آزمائشیں آئیں، کچھ خارجی، کچھ داخلی، مگر جماعت کے رفقاء ثابت قدم رہے۔ داخلی آزمائشوں میں انتخابی سیاست میں شرکت کا مسئلہ بہت نازک رہا۔ ماضی میں اکابر اور بڑی بڑی شخصیات کی آراء مختلف رہیں۔ تلخ مباحث بھی ہوئے لیکن کیا مجال کہ کہیں شخصیات کا ٹکراؤ ہوا ہو یا ذاتی رنجشوں نے جگہ پائی ہو۔ اسلامی اسپرٹ اس جماعت کا جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس اجتماعیت کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔ ورنہ آزاد ہندوستان میں ہر مسلم جماعت تقسیم اور انتشار سے دوچار ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں الٰہ آباد کے تاسیسی اجتماع سے لیکر ۲۰۰۹ء کے بنگلور اجلاس تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ زندہ انسانوں کی زندہ جماعت نظر آتی ہے، جس کا تصور نہ تو شخصیات کی بنیاد پر قائم ہونے والی جماعتوں میں کیا جاسکتا ہے نہ نام نہاد جمہوری پارٹیوں میں۔ بنگلور کے اجلاس میں دو خواتین بھی تھیں جو آٹھ سو سے زیادہ خواتین کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ امور ومسائل پر ان کے اظہار خیال میں زبردست خود اعتمادی دیکھی گئی۔۔۔ اور اجلاس میں نوجوان رفقاء کی کارکردگی دیکھ کر تو دل بے اختیار پکار اٹھا کہ اس ملک میں تحریک اسلامی کا مستقبل بحمد اللہ محفوظ ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ (پ ر)

حکومت......اصلاح معاشرہ کا ایک اہم ذریعہ

احمد ابو سعید
یوسف گوڑہ، حیدرآباد

قرآن، حدیث اور آثار صحابہؓ میں حکومت، اقتدار اور صالح حکام کی بڑی اہمیت، ضرورت اور افادیت بیان کی گئی اور اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح اور ہدایت کی خاطران سب کے حصول کے لئے جدوجہد کا حکم دیا گیا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ جہاد اور اسلامی حکومت سے جس قدر ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں۔ اسلام کی کسی اور چیز سے نہیں۔ اسی لئے وہ جہاد اور اسلامی حکومت کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ جس ملک کے بارے میں طاغوت کو یہ خبر ملتی ہے کہ وہاں اسلامی حکومت قائم ہونے جارہی ہے اس کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی مغرب زدہ سیکولر قائدین ہی نہیں بلکہ بعض علماء بھی اسلامی حکومت کی مخالفت کررہے ہیں۔ وہ اسے دنیاداری اور سیاست بازی قرار دیتے ہیں کہ اسلام میں فرد کی اصلاح اور انفرادی دینداری کو اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں پایا جاتا کہ مسلمان اسلام کے غلبہ اور حکومت کیلئے جدوجہد کریں۔ یہ موجودہ زمانے کے بعض مفکرین کا اختراع کردہ غیر اسلامی تصور ہے۔ ان کا اس سلسلے میں یہ بھی خیال ہے کہ انسان اور خدا کے مابین عبدیت کا رشتہ ہے نہ کہ حاکم اور محکوم کا۔

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قاسمی اپنے مضمون ''اسلامی ریاست کا ہدف حکمرانی یا اسلام کا نفاذ'' میں لکھتے ہیں: ''اسلام کے خلاف مغربی دنیا نے نئے نئے افکار ونظریات کے ذریعے سازشوں اور حملوں کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ عام مسلمان تو کجا، مسلم دانشور اور علماء بھی اس طوفان کی زد سے نہ بچ سکے۔ خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمان جمہوریت اور نیشنلزم جیسے کفر پر مبنی نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ وقتاً فوقتاً مسلم دانشور اور علماء کی طرف سے ایسی ایسی کتابیں رسالے اور مضامین شائع کئے جاتے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زبان سے اسلام دشمن عناصر کی ترجمانی ہوتی ہے''۔ (منصف ۲۴/اپریل ۲۰۰۹ء)

اسلامی حکومت کا مسئلہ موجودہ زمانے میں بڑی اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے اور متعدد مسلم اکثریتی ممالک اس کے لئے عملاً کوشاں ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی حکومت کی اہمیت کے پیش نظر اس کے مختلف پہلو مدلل کئے جائیں۔

ایک حدیث میں موجودہ زمانے کے حکمرانوں کی گمراہیوں اور مظالم کی جو پیشن گوئی کی گئی تھی وہ حیرت انگیز طور پر حقیقت نظر آتی ہے: ''سنو! اس وقت اسلام کی چکی گھوم رہی ہے۔ پس تم کتاب اللہ کے ساتھ چلو جدھر وہ جائے۔ سنو! اللہ کی کتاب اور اقتدار ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے، تو تم کتاب اللہ کا ساتھ دینا۔ سنو! تم پر ایسے گمراہ حکام مسلط ہوں گے جو تمہارے لئے (غیر اسلامی) قانون بنائیں گے۔ اگر تم نے ان کے قوانین اور فیصلوں کو مانا تو وہ تمہیں غلط راہ پر ڈال دیں گے۔ اور نہ مانا تو قتل کردیں گے''۔ (صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ اس صورتحال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں وہی کچھ کرنا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا۔ وہ آروں سے چیر دیئے گئے۔ سولی پر لٹکا دیئے گئے۔ پھر بھی ان کی تردید اور مخالفت کی۔ اللہ کی اطاعت میں جان دے دینا اس زندگی سے بہتر ہے جو خدا کی نافرمانی میں بسر ہو''۔ (معجم کبیر طبرانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب اسلام کا شیرازہ بکھرے گا، تو جب کوئی شیرازہ ادھیڑے گا تو لوگ بجائے اس کو درست کرنے کے بقیہ پر قناعت کرلیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے حکومت عادلہ (خلافت راشدہ) کا شیرازہ بکھرے گا اور آخر میں نماز کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا''۔ (ترغیب، بحوالہ ابن حبان)

یہ حدیث اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ جب اسلامی حکومت میں خرابی پیدا ہوجائے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اس کی اصلاح کے لئے اپنی مقدور بھر جدوجہد کریں۔ اسلامی حکومت کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جاسکتا ہے: ''جب تک حکام قرآن کی روشنی میں فیصلے نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کو نہیں اپنائیں گے، من جانب اللہ آپس میں لڑتے رہیں گے''۔ (ابن ماجہ)

اسلامی حکومت کی اہمیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ دعا فرمائی تھی: ''اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنادے''۔ (بنی اسرائیل: ۸۰) اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: ''حدیث میں آیا ہے: ''اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعے ان چیزوں کا سدباب کردیتا ہے۔ جن کا سدباب صرف قرآن (کی تعلیم) سے نہیں کرتا۔ حکومت کی وجہ سے لوگ گناہوں سے رک جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ صرف قرآن کی تعلیم سے باز نہیں آتے''۔ (تفسیر ابن کثیر) اسی آیت کے تحت امام بن جریرؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے نبی جانتے تھے کہ اقتدار وحکومت کے بغیر اس کام کو پورا کرنے کی طاقت میرے پاس نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھے وہ حکومت مل جائے جو میری مددگار ثابت ہو''۔ (تفسیر ابن جریر جلد: ۱۰)

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں: ''بادشاہ روح کی مانند ہے اور عام انسان بدن کی مانند اگر روح درست ہے تو بدن درست ہوگا۔ اور اگر روح خراب ہے تو بدن بھی خراب ہوگا۔ پس (بادشاہ یا حاکم) کی اصلاح کیلئے جدوجہد تمام اولاد آدم کی اصلاح کی جدوجہد ہے''۔ (مکتوبات دفتر دوم نمبر ۶۷)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں: ''شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر عمل بھی نہیں ہوسکتا، اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ بغیر حکومت کے قرآن مجید کا ایک پورا حصہ قابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی بغیر قوت کے ممکن نہیں۔ ''اس لئے قرآن حکیم غلبہ وعزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابر صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین پر مقدم رکھا''۔ (سیرت سید احمد شہید)

اسلامی حکومت کی ضرورت اور اہمیت اور اس کے لئے جدوجہد کے بارے میں چند مزید احادیث، آثار صحابہ کرام اور اقوال علماء پیش ہیں جن سے یہ بات بھی اُجاگر ہوتی ہے کہ اسلام کے غلبہ اور حکومت کیلئے جدوجہد کا تصور جدید نہیں بلکہ قرآن وحدیث پر مبنی قدیم، مسلمہ اور اجماعی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ عمارت گرجاتی ہے اور جس کا کوئی نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے''۔ (الدیلمی عن ابن عباس۔ کنزالعمال وغیرہ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے: ''تم اس دین پر اس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمہارے ائمہ خود اس دین پر قائم رہیں گے اور تمہیں قائم رکھیں گے''۔ (بخاری) اگر ایسا نہ ہوسکا تو ظاہر ہے کہ مسلم معاشرے پر اس نقص اور کمی کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے: ''خدا کی قسم اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعے برائیوں کا جو سدباب کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو قرآن پاک کے ذریعے کرتا ہے''۔ (کنزالعمال، تاریخ خطیب بغدادی)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں: ''اس امت کے برپا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو اور اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دین غالب نہ رہے''۔ (حجۃ اللہ البالغہ) یعنی امت مسلمہ کا نصب العین اسلام کو غالب اور نافذ کرنا ہے۔

ابن خلدون لکھتے ہیں: ''مذہب کے اصولی معیار پر انسان کا اجتماعی ہیئت کے ساتھ حکومت وسلطنت قائم کرنا بھی خدائی شریعتوں کے دائرۂ عمل میں داخل ہے''۔ (بحوالہ اسلام کا نظام حکومت صفحہ ۲۶) یعنی اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد مشروع اور مفروض ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے، بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے بھی کامیابی نہیں ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہوسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے، لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی، قتال ہوا، اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلام اٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز، روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا''۔ (آثار رحمت، ص: ۱۰۴)

مولانا تھانویؒ دوسرے بیشتر علماء کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ اسلام کے غلبہ اور حکومت کے لئے صرف اصلاح معاشرہ کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے اقدامی جہاد کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس کے برعکس مخالفین کہتے ہیں کہ غلبہ اور حکومت وراثت، مفت اور انعام میں ملتی ہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کو کسی قسم کی کوئی جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں: ''آل انڈیا جمعیۃ علمائے اسلام کی قرارداد (۱۹۴۵ء) میں زیر صدارت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پانچ سو سے زائد علماء ومشائخ کی موجودگی میں جو پاس کی گئی تھی اس کے متن کا ایک حصہ یہ ہے: ''یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا سیاسی ودینی نصب العین عالم گیر خلافت اسلامی علی منہاج نبوت محمدیؐ کی تاسیس اور شریعت اسلامیہ کے نظام کا قیام ہے اور لازم وضروری ہے کہ مسلمان انفرادی واجتماعی طور پر اس نصب العین کو حاصل کرنے اور تاسیس خلافت کے ذریعے عالم اسلام کی مرکزیت قائم کرنے کیلئے فی سبیل اللہ جدوجہد جاری رکھیں''۔ ''انسانیت کی نجات اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ خلافت اسلامیہ علی منہاج نبوت محمدیہ کی عالمگیر سلطنت و دستور اساسی دنیا میں قائم کیا جائے''۔ (خطبات علامہ شبیر احمد عثمانیؒ)

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، جانشین مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں: ''حکومت الہیہ کا قیام جملہ انبیاء کی دعوت کا جزو رہا۔ آسمانی شریعتوں کے نزول کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان دنیا میں منشائے خداوندی کے موافق زندگی گزاریں''۔ اگر انبیاء ورسل کی ضرورت اور وحی کی طرف احتیاج مسلم ہے تو دنیا میں نظام سلطنت منشائے خداوندی کے موافق قائم کرنا اور اس کے خلاف دوسرے نظاموں کو مٹانا یا مغلوب کرنا بھی ضروری ہے''۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں: ''اسلام مذہب بھی ہے اور سیاست بھی، اس کے مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا مساوات وعدل قائم کرنا اور اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا۔ دنیا سے سود، بدکاری، شراب خوری، قمار بازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا، اس کے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں''۔ (ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۳۹ء)

قاری محمد طیب قاسمیؒ ''فطری حکومت'' میں لکھتے ہیں: ''آسمانی بادشاہت یا حکومت الٰہی کے عنوانات آج ایسے نئے نہیں رہے جن سے کوئی آشنا نہ ہو۔ اس عنوان کو سب سے پہلے میرے برادر معظم حضرت مولانا محمد میاں عرف مولانا منصوری مرحوم۔ رفیق خاص حضرت اقدس سیدنا شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ نے اختیار فرمایا اور اس عنوان سے ایک مختصر اور جامع رسالہ سپرد قلم فرما کر شائع کرایا''۔ (فطری حکومت، صفحہ ۱۲)

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی وجود میں نہیں آئی تھی۔ یہی مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند اسی کتاب میں فرماتے ہیں: ''محترم مولانا مودودی صاحب نے مستقلاً اسی عنوان سے اپنی تحریک شروع کی اور اسی کی اساس پر جماعت اسلامی کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی۔ اس تحریک وتشکیل نے اجتماعیات اسلامی کی حد تک تو قوم کو کافی فائدہ پہنچایا اور معتدل ومتین طرز بیان نے اور طریق استدلال نے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو عموماً متاثر کیا''۔ (فطری حکومت ۱۹۴۹ء)

حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ فرماتے ہیں: ''نفس تحریک اقامت دین ودستور اسلامی کی سعی مشکور ہے۔ اس کی مخالفت منشائے حق کی مخالفت ہے۔ جس طرح ممکن ہو تائید و نصرت سے گریز نہ کیا جائے''۔ (مکتوبات ثلاثہ)

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے: ''پاکستان کا تخیل، خالص حکومت اسلامی کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کانوں میں پڑیں۔ بس صرف حضرت (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا۔ لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں''۔ (حکیم الامت، نقوش وتاثرات، ص: ۲۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا مودودیؒ اور شیخ حسن البنا شہیدؒ نے امت مسلمہ کے لئے اسلامی حکومت کا جو مشن اور نصب العین پیش کیا تھا وہ قرآن وسنت اور اجماع امت کے مطابق جدید نہیں بلکہ قدیم تھا!

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: ''میں اپنے بارے میں صراحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی لمحے اور کسی وقفے میں بھی ان لوگوں میں نہیں رہا ہوں جو دین وسیاست کی تفریق کے قائل ہیں''۔ ''میں ان لوگوں کی اگلی صف میں ہوں جو مسلمان قوموں کے صحیح سیاسی تصور کے داعی ہیں اور ہر اسلامی ملک میں صالح قیادت کو بروئے کار دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ دینی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک دین کو اقتدار حاصل نہ ہو اور حکومت کا نظام اسلامی بنیادوں پر استوار نہ ہو''۔ (نیا طوفان اور اس کا مقابلہ)

سورہ حدید، آیت ۲۵ کے تحت پروفیسر محسن عثمانی ندوی لکھتے ہیں: ''اس آیت میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اس دنیا میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے اور ان تین چیزوں کے مجموعے کو اگر کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ اسلامی نظام ہے''۔ ''بہ الفاظ دیگر عقائد وعبادات کے ساتھ قوانین شریعت اور پھر وہ قوت نافذہ جس کے زور سے لیقوم الناس بالقسط کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ بندگان خدا کے لئے وہ عظیم نعمت ہے جو خدا نازل فرماتا ہے''۔

''دین کی صرف یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے یا خدا کی بڑائی کا نفسیاتی سطح پر اعتراف ہے یا اپنی بندگی کا حیاتی مظہر ہے۔ یہ چیزیں دین کے تین مختلف پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو کو شامل ہے، یہ کل دین نہیں۔ دین انسان کے تین پہلوؤں پر محیط ہے: (۱) بندے کا خدا سے تعلق (۲) بندے کا اپنی ذات سے تعلق (۳) بندے کا دیگر بنی نوع انسان اور مخلوقات سے تعلق''۔ (دین کا متوازن تصور، صفحہ ۱۰۔ ۱۶) اسلامی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حق اللہ اور حقوق العباد سے متعلقہ ان امور کی نگرانی کرے۔

مولانا مودودیؒ جو موجودہ زمانے میں اسلامی حکومت کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''لوگ یہ سمجھتے ہیں اور انہیں ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومت الہیہ سے مراد محض ایک سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو''۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے تو اس پر بہ آسانی یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیش نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی، انفرادی اور اجتماعی میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے، جس کیلئے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا''۔ (دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات)

مولانا مودودیؒ کے اس بیان سے بھی اسلامی حکومت کا عظیم مقصد اجاگر ہوتا ہے اور اس سے متعلقہ ایک غلط فہمی دور ہوجاتی ہے: ''خلافت راشدہ جس کے امتیازی خصائص اور بنیادی اصول گزشتہ صفحات میں بیان کئے گئے ہیں۔ حقیقت میں محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی، بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی۔ یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائے۔ امن قائم کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلم، مربی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ دارالاسلام میں دین حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل وروح کے ساتھ چلائے اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگا دے۔ اس بنا پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافت راشدہ ہی نہ تھی، بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی۔ خلافت علی منہاج النبوۃ کے الفاظ اس کی انہی دونوں خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں اور دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہوسکتا کہ اسلام میں اصل مطلوب اسی نوعیت کی ریاست ہے نہ کہ محض ایک سیاسی حکومت''۔ (خلافت وملوکیت، صفحہ: ۸۷)

جو لوگ اسلامی حکومت کے مخالف ہیں وہ نہ اسلام کو ٹھیک سے جانتے ہیں اور نہ اسلامی حکومت اور اس کے اغراض ومقاصد کو اور نہ ہی تاریخ اسلام کو۔ بلکہ وہ اسلام کے حقیقی مقصد سے بھی کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے۔ سیاست اور حکومت اسلام سے علیحدہ اور بے تعلق کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک اہم جزلاینفک ہے۔ جس کے بغیر نہ مکمل اسلام پر عمل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کے بغیر اسلام کے مطلوبہ فرد اور معاشرے کی تعمیر ممکن ہے۔

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قاسمی بعنوان: ''خلافت کا قیام اور امت مسلمہ کی ذمے داریاں'' فرماتے ہیں: ''شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے خلافت کی تعریف اس طرح کی ہے: ''خلافت اس عمومی سربراہی اور ریاست عامہ کا نام ہے جو اقامت دین کے کام کی تکمیل کیلئے وجود میں آئے۔ اس اقامت دین کے دائرۂ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکان اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے تعلقات کا انتظام حدود کو قائم کرنا......امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے''۔ (بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، جلد ۵، از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

مذکورہ امور اور سرگرمیاں سیاسی نہیں بلکہ خالص دینی ہیں۔ مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قاسمی لکھتے ہیں:

☆''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کرنا اور خلافت قائم ہونے تک کوششیں جاری رکھنا، امت مسلمہ پر شرعاً فرض ہے۔ یہ نفل یا غیر تاکیدی سنت نہیں ہے۔ یہ اسی طرح فرض ہے جیسے پانچوں وقت کی نماز فرض ہے......خلافت قائم کرنے کی فرضیت قرآن وسنت اور اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے''۔ ☆''اللہ اور رسولؐ کی کامل اطاعت خلیفہ وامام کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ اللہ و رسولؐ کے احکام و تعلیمات کا بیشتر حصہ اجتماعیت سے تعلق رکھتا ہے اور امت مسلمہ کی اجتماعیت جو عند اللہ مطلوب ہے، خلافت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اللہ ورسول کی کامل اطاعت فرض ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور خلافت کے بغیر اللہ ورسولؐ کی کامل اطاعت کی کوئی دوسری راہ نہیں۔ اس لئے خلافت کا قیام امت مسلمہ پر فرض ہے''۔ ☆''اس وقت امت مسلمہ پر بہت بڑا فرض ہے۔ اقامت دین کیلئے خلافت راشدہ کے قیام کی طرف لوٹنا، قرآنی ہدایت ''ادخلوا في السلم كافة'' پر عمل کرنا'' ☆''أطيعوا الله وأطيعوا الرسول'' کا نظام نافذ کرنے کے لئے کوشش کرنا''۔ ☆''جب تک خلافت قائم نہیں ہوجاتی، پوری امت پر یہ فرض باقی رہے گا۔ جو لوگ اس راہ میں سرگرم اور مصروف ہیں وہ اپنے فرض کو ادا کررہے ہیں اور جو خلافت کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں وہ بس عذاب الٰہی کا انتظار کریں''۔ (روزنامہ منصف، ۱۰/اپریل ۲۰۰۹ء)

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قاسمی اپنے ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں: ''سیکولر نظریات سے متاثر علماء و دانشوران کی رائے میں انسان اور خدا کے مابین عبدیت کا رشتہ گہرا ہے اور یہی مقصود ہے۔ اس کے لئے بس تنہائی میں ذکر الٰہی میں مشغول رہنا، خوف خدا کے غلبہ سے گریہ وزاری کرنا، ذاتی زندگی میں اچھے کام کرنا اور لوگوں کو اچھے اخلاق کی نصیحت کرنا بس یہی عبدیت کا حق ادا کرنا ہے۔ ان حضرات کی نظر میں بندہ اور رب کے درمیان حاکم ومحکوم کا رشتہ محض رسمی رشتہ ہے۔ یہ خیال قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے رشتہ عبدیت کیلئے حاکم ومحکوم کا رشتہ معیار اور دلیل ہے۔ اطاعت کے بغیر عبدیت کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا''۔ مولانا مزید لکھتے ہیں: ''مفکرین اسلام میں سے جن حضرات نے اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اس مقصد کیلئے کوشش کررہے ہیں، وہ دراصل قرآن وسنت کے تمام احکام کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، ذاتی زندگی میں بھی اور معاشرے میں بھی اور جو لوگ قرآن وسنت سے محض نماز، روزہ، حج اور فرد کی زندگی سے متعلق احکام پر عمل کرنے پر اکتفا کررہے ہیں وہ دراصل اسلام کو ناقص شکل میں پیش کرتے ہیں''۔ (منصف ۲۴/اپریل ۲۰۰۹ء)

مولانا صادق الاسلام العمری لکھتے ہیں: ''ہندوستان میں ہندوستان کا قانون چلتا ہے، امریکہ میں امریکہ کا اور انگلستان میں انگلستان کا۔ اللہ کی سرزمین پر اس کے آسمان کے نیچے اس کے بندوں کے اوپر اللہ کا قانون چلنا چاہئے یا اپنا اپنا من چاہا قانون چلنا چاہئے؟ اللہ کا قانون نافذ کرنے والوں کا ساتھ دینا چاہئے یا ان کی مخالفت کرنی چاہئے؟ اور ان کو تباہ وبرباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے؟ جہاد اللہ کے قانون کو اللہ کی اتباع اللہ کے بندوں پر نافذ کرنے کی ہر کوشش کا نام ہے''۔ (منصف ۷/اپریل ۲۰۰۹ء)

مغرب، اسلام کی مقبولیت سے خوفزدہ

عارف عزیز (بھوپال)

اسلام کو ایک جارح مذہب کے طور پر پیش کرنا مغرب کا پرانا مشغلہ ہے، جسے وہاں کے دانشور بالخصوص مستشرقین نے عرصۂ دراز سے اختیار کررکھا ہے، آج اس مہم میں شدت اس لئے محسوس ہورہی ہے کہ مغرب کے عوام میں فکری طور پر اسلام سے متاثر ہونے کا عمل تیز ہوگیا ہے۔ یورپ وامریکہ میں فروغ اسلام کی اس لہر پر قابو پانے کے لئے مسلمان، ان کی تہذیب، عقائد، اقدار اور مذہب سے وابستہ پورے نظام پر حملے ہورہے ہیں، جارج ڈبلیو بش کا صلیبی جنگ کے لئے لگایا گیا نعرہ ہو یا پیغمبر اسلام ﷺ پر تشدد کی تعلیم دینے کا الزام یا جہاد کو تشدد سے تعبیر کرنے کی حکمت عملی، سب کے پس پشت ایک ہی مقصد کارفرما ہے کہ اسلام کو ایک جارح مذہب ثابت کرکے اس کی مقبولیت پر روک لگائی جاسکے۔

تاریخ کے پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو صلیب وہلال یا دوسرے الفاظ میں مغرب اور اسلام کی یہ کشمکش کافی پرانی ہے۔ عروج اسلام کے بعد سے عیسائی دنیا نے مسلمانوں پر کروسیڈ کے نام پر ایک دو نہیں سات صلیبی جنگیں مسلط کیں، جو بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی، کی فتح پر انجام کو پہنچیں، اس وقت شاہ لوئی نہم نے مسلمانوں سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اہل مغرب کو نصیحت کی تھی کہ ''اگر تم مسلمانوں پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہو تو فوج کشی کے بجائے ان کے عقیدہ پر ضرب لگاؤ تاکہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں گرجائیں''۔ شاہ فرانس کی اس نصیحت پر یورپ کے حکمرانوں سے زیادہ مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے توجہ دی، پاپائے روم کی اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر کچھ عرصہ پہلے کی گئی تنقید اسی سلسلے کی کڑی ہے، بالخصوص ان کا یہ الزام کہ: ''اسلام دنیا میں تلوار کے زور پر پھیلا'' اس مہم کا ایک حصہ ہے جو مغرب نے اسلام کے خلاف چھیڑرکھی ہے اور جس کا مقصد فکری وعملی سطح پر اسلام کے مقابلے میں پسپائی کے بعد دنیا کو اس کے بارے میں گمراہ کرنا ہے۔ اس طرح کے الزامات کا ماضی میں مسلم علماء مدلل جواب دے چکے ہیں، ہندوستان میں علامہ شبلی نعمانی اور سید صاحب علیہ الرحمہ نے سیرت النبی لکھ کر پیغمبر اسلام ﷺ کے اعلیٰ انسانی خصائل اور فکر کی بلندی کو ثابت کیا تھا، سرسید علیہ الرحمہ بھی بدنام زمانہ ولیم میور کے سیرت النبیؐ پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دے چکے ہیں، دوسرے مفکرین نے بھی اسلام کے اوپر عائد اس اتہام کا کہ ''یہ مذہب تلوار کی زور پر پھیلا ہے'' مسکت جواب دیتے ہوئے واضح کیا کہ اپنے ظہور کے پہلے دن سے اسلام سلامتی کا مذہب رہا ہے، دنیا جانتی ہے کہ مکہ مکرمہ جہاں سے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، وہاں تلوار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں نہیں، ان کے نہ ماننے والوں کے قبضے میں تھی۔

نبی پاک ﷺ پر جو حلقے جنگ باز ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں، وہ اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۵۳ برس کی عمر تک لڑنا تو کجا، کبھی ہتھیار بھی ہاتھ میں نہیں لیا، حالانکہ اس وقت عرب معاشرے میں لڑائی جھگڑا عام تھا، ہر شخص کم عمری سے فن سپہ گری میں طاق ہوجاتا تھا، زندگی کے آخری ایام میں مدینے کے قیام کے دوران آپ کو جن خونریز جنگوں کا سامنا کرنا پڑا ان کے محرک آپؐ کے حریف تھے، حضور ﷺ میدان جنگ میں تشریف لائے تو آپؐ نے جنگ کو بھی عبادت بنادیا، حکم صادر ہوا کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں اور عبادت گاہوں میں کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، فرمان الٰہی تھا کہ صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑنے پر کمربستہ ہوں، تاکید فرمائی کہ دوسرا حریف صلح کرنا چاہے تو اس کی پیشکش کو قبول کرلو، نبی رحمت ﷺ تشریح فرماتے رہے کہ جنگ کا مقصد سمجھ لو، یہ نہ مال غنیمت کے لئے ہے اور نہ اقتدار کے حصول کے لئے، قرآن پاک میں مقصد جہاد کی وضاحت یوں کی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ ایک کے ذریعے دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو راہبوں کی خانقاہیں، یہود ونصاریٰ کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھا دیئے جاتے، اسی لئے دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں بھی تلوار اٹھائی، اس کا مقصد اپنا اور مظلوموں کا دفاع کرنا تھا، غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کرنا ہرگز نہیں اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنا تھا، جس میں تمام مذاہب کی آزادی برقرار رہے اور ان کے ماننے والے کسی پابندی کے بغیر اپنے مذہبی فرائض ادا کرسکیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی دنیا کے سامنے ہے جس سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جاسکتی کہ کسی شخص کو ایمان لانے پر مجبور کیا گیا ہو، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بہت سے قریبی اعزاء کی موت کفر کی حالت میں ہوئی، کفار مکہ ہوں یا مدینہ کے یہودی قبائل، انھوں نے اسلام جیسے امن واخوت کے مذہب اور اس کے علمبرداروں کی مخالفت، اس لئے کی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مساوات انسانی کی یہ تحریک ان کے صدیوں سے چلے آرہے استبدادی معاشرے کو مٹا دے گی، لہٰذا مدینہ منورہ میں جن اعلیٰ اصولوں

باقی صفحہ ۶ پر

ہولوکاسٹ کا مفروضہ صرف باتوں سے حقیقت نہیں بن سکتا

ایرانی صدر نے بحث کا جو چیلنج دیا ہے آج تک اسے قبول کرنے کی ہمت کوئی نہیں کر رہا ہے، 'ہولوکاسٹ' اسرائیل کے لئے جواز نہیں بن سکتا

امریکی صدر بارک حسین اوباما جب امریکہ سے مصر پہنچے تو وہاں عالم اسلام سے خطاب کرتے ہوئے ہولوکاسٹ کا واضح طور پر ذکر نہیں کیا تھا۔ صرف اتنا کہا تھا کہ یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے گئے انہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، انہیں بھی جینے کا حق ملنا چاہئے یعنی ان مظالم کو انھوں نے اسرائیل کے وجود کے جواز کے طور پر پیش کیا۔ مصر سے جب وہ جرمنی گئے اور وہاں دوسری جنگ عظیم میں مفروضہ یہودیوں کی ہلاکت کی یادگار پر ایک سفید گلاب رکھتے ہوئے پہلے تو اسرائیل اور امریکی یہودیوں سے اظہار یکجہتی کیا پھر یہ کہا کہ یہ یادگار اس بات کا ثبوت ہے کہ جرمن نازیوں نے ۵۶ ہزار یہودیوں کو ہلاک کرکے ان کی نسل کشی کی تھی اور جو لوگ ہولوکاسٹ کو مفروضہ کہتے ہیں۔ انہیں آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا کہ ہولوکاسٹ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کی تکذیب نہیں کی جاسکتی جو لوگ یہودیوں کی نسل کشی کے اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں وہ جاہل اور قابل نفرت ہیں۔

مسٹر بارک حسین اوباما نے 'ہولوکاسٹ' کے منکرین کا نام تو نہیں لیا تاہم ان کا اشارہ ایران کے صدر محمود احمدی نژاد کی طرف تھا۔ حالانکہ حالیہ عرصے میں ایرانی صدر کے علاوہ ایک پادری نے بھی کیا تھا جسے جرمن چانسلر انجیلا مورکل اور دنیا کی یہودی آبادی کے سخت اعتراض اور دباؤ کے بعد عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ تاہم اصل ہنگامہ تو ایرانی صدر کے بیان پر ہے جنھوں نے نہ صرف ہولوکاسٹ کو ایک مفروضہ قرار دیا بلکہ اس پر بحث کے لئے چیلنج کردیا اور اس چیلنج کو آج تک کسی نے قبول نہیں کیا۔ اگر واقعی ہولوکاسٹ کوئی تاریخی حقیقت ہوتا تو ضرور کوئی ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کا چیلنج قبول کرنے کے لئے سامنے آتا۔ اس پر بحث کرنے کی ہمت نہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں صرف مفروضہ ہے اور جو لوگ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں انہیں دلائل کے ذریعے نہیں بلکہ بزور قوت خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور صرف یہ شور مچایا جاتا ہے کہ یہودیوں کی نسل کشی کا واقعہ صحیح ہے اور اس کے منکرین تاریخ سے نابلد ہیں۔

مسٹر احمدی نژاد نے ایک بات اور کہی تھی جسے ہمیشہ 'ہولوکاسٹ' سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے اور اسے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ہولوکاسٹ ایک حقیقت ہے پھر بھی اس سے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے وجود کا جواز کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ یہودیوں پر جہاں زیادتی ہوئی، وہیں پر ان کے ساتھ انصاف کیا جاتا اور انہیں ایک الگ ملک بنا کر تاوان دیا جاتا ہے۔ اس کا بدلہ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں سے کیوں وصول کیا جارہا ہے۔ آخر 'ہولوکاسٹ' میں مسلمانوں کا کیا رول تھا کہ یہودیوں کو اسرائیل کی صورت میں مشرق وسطیٰ میں تھوپ دیا گیا اور نہایت ہی بے شرمی کے ساتھ اب بھی ہولوکاسٹ کو اسرائیل کے وجود کے جواز کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

ہولوکاسٹ یا ۵۶ ہزار یہودیوں کی نسل کشی ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا شور تو خوب مچایا جاتا ہے لیکن جیسے ہی اس پر سوال کھڑا کیا جاتا ہے، کوئی بھی اسے ثابت کرنے کے لئے آگے نہیں آتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی جو تاریخ بتائی جاتی ہے وہ پرانی بھی نہیں ہے۔ اس دور کے بہت سے لوگ اب بھی زندہ ہوں گے پھر بھی اس واقعہ کو ثابت نہیں کیا جاسکا۔ جو کوئی اس پر اعتراض کرتا ہے اسے جواب میں یا تو برا بھلا کہا جاتا ہے جیسا کہ اوپر مسٹر بارک حسین اوباما نے کہا ہے یا اس کا منھ بند کرنے کے لئے کارروائی کی دھمکی دی جاتی ہے۔ اس طرح اب تک اس مسئلہ کو ایک مفروضہ کی شکل میں برقرار رکھا گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ واقعہ کا تعلق یورپ سے بتایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہودیوں پر ظلم یورپ میں ہوا اور معاوضہ عالم اسلام سے مشرق وسطیٰ میں وصول کیا جارہا ہے جس کا ہولوکاسٹ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ایک تو ہولوکاسٹ مفروضہ اوپر اسرائیل کے وجود کا جواز بھی مفروضہ ہے۔

●●

تاتاریوں میں اسلام کے احیاء سے روس پریشان

روس کی چار فیصد آبادی والے تاتاریوں کا رجحان اسلام کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ اسلامی طرز زندگی کی طرف تیزی سے مائل ہورہے ہیں۔ امریکی صدر بارک حسین اوباما تو اعلان کر رہے ہیں ''امریکہ نہ اسلام سے جنگ لڑ رہا ہے اور نہ ہی کبھی لڑے گا''۔ اعلان کے برعکس امریکہ کا عمل آج تک کیا ہے یہ تو ساری دنیا کے سامنے ہے اور آئندہ کیا ہوگا یہ ان کے عملی اقدامات سے سامنے آجائے گا۔

اب تک تو صلیبی، صہیونی، ہندتووادی، دین والے اور بے دین حتیٰ کہ ملحد، دہریئے کمیونسٹ بھی سب اسلام اور مسلمانوں ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو اسلام کو سمجھنا نہیں چاہتے، پڑھنا نہیں چاہتے اور اس کی معنویت، معقولیت وافادیت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ تعصب کے چشمے لگا کر مخالفانہ اور معاندانہ افکار کے تحت ''بل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا'' کی رٹ لگائے چلے جارہے ہیں۔ ''وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پھیلا کر رہے گا۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کردے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''۔ روسی بھی اسلام دشمنی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں جبکہ سوویت یونین اور کمیونزم کے دور میں تو وہ دین اور مذہب ہی کے دشمن رہے ہیں مگر اسلام ہے کہ مٹنا تو دور دب کر رہنے کو بھی تیار نہیں ہے کہ کئی صدیوں تک اس کے ماننے والے اپنی بے عملی، سست روی اور دین سے دوری کے نتیجے میں زوال اور پستی سے دوچار رہے ہیں۔ عروج وترقی کی بلندیوں سے محروم رہے ہیں۔ یہاں تک کہ مغلوب اور غلام بن کر رہنے پر مجبور ہوگئے، قعر مذلت کی انتہائی گہرائیوں میں گرنے کے بعد ان کے اندر بیداری اور شعور کی چنگاریاں چمکنے شروع ہوئیں۔ وہ غلامی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، پستی کی گہرائیوں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ عروج اور ترقی وفلاح سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی آزاد اور خود مختار مملکتیں قائم کرنا اور اسلامی قوانین، اسلامی نظام زندگی اور اسلامی نظام حکومت نافذ کرنا چاہتے ہیں تو اب تک جو طاقتیں ان کو غلام بنائے ہوئے تھیں وہ انہیں غلامی اور مغلوبیت سے آزادی کا پروانہ دینا نہیں چاہتیں۔ وہ اب بھی مسلمانوں کو داب کر رکھنا چاہتی ہیں، بس یہی ایک کشمکش ساری دنیا میں برپا ہے۔

روس کے تاتاریوں میں بھی اسلامی بیداری کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ وہ اسلامی زندگی اپنانا اور اسلامی نظام خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایک تنظیم حزب التحریر تشکیل دے رکھی ہے۔ روسی انہیں مذہبی آزادی، اظہار خیال کی آزادی اور اپنے عقائد ونظریات پر عمل کی آزادی دینا نہیں چاہتے۔ الماذ خسانوف کہتے ہیں ''میں ایک سیاسی پارٹی حزب التحریر کا ممبر ہوں۔ حزب التحریر نے ایک بیان تیار کیا ہے۔ اس تنظیم کا مقصد ایک اسلامی طرز زندگی نافذ کرنا اور اسلامی خلافت قائم کرنا ہے''۔ وہ ہرے رنگ کے ایک پنجرے میں اپنے ہی جیسے ایک ملزم کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مائکروفون تھا جس پر وہ بول رہے تھے۔ ان کے بیان نے نیویارک ٹائمز (بحوالہ ایشین ایج ۵ر جون) کے مطابق کھچا کھچ بھرے کورٹ روم میں اضطراب اور بے چینی کی لہریں پیدا کردیں۔ لکھا ہے خسانوف خود ساختہ مذہبی انقلابی ہیں جس نے تاتارستان کی راجدھانی کزان میں ایک مدت سے رائج طرز زندگی کو چیلنج کرنے کی قسم کھائی ہے۔ یہ علاقہ ایک قدیم مسلم علاقہ ہے۔ خسانوف کے خلاف ۱۱ دوسرے افراد کے ساتھ قانونی کارروائی چل رہی ہے جن پر دہشت گرد تنظیم کی رکنیت اختیار کرنے اور پرتشدد انداز میں حکومت کا تختہ پلٹنے کا الزام ہے جبکہ زیادہ تر لوگوں نے اس گروپ سے تعلق رکھنے کی تردید کی ہے اور ان کے دوست اور حقوق انسانی کے وکلاء کا کہنا ہے کہ روسی پولیس اور انٹلیجنس کے ایجنٹوں نے اس کیس میں غلط اور بے بنیاد شواہد جمع کرنے کے لئے زدوکوب اور ٹارچر واذیت رسانی کے طریقے اختیار کئے ہیں۔

ان سب کے برعکس خسانوف نے آزادانہ طور پر حزب التحریر کا ممبر ہونے کا اعتراف واقرار کیا اور پرزور انداز میں کہا یہ اس کا حق ہے۔ جبکہ روسیوں اور سابق سوویت یونین کے بیشتر ملکوں نے حزب التحریر کو دہشت گرد تنظیم قرار دے کر اس پر پابندی عائد کررکھی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کی راہ اختیار کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جبکہ امریکہ اور بیشتر یورپی یونین کے ملکوں میں اس کو کھل کر کام کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ اگرچہ وہاں بھی اس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ تاہم روسی آرتھوڈوکس اور کچھ دوسرے حزب التحریر سے معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ نیویارک ٹائمز نے لکھا ہے یہ ''تنظیم'' ''ماقبل جدیدیت کے دین'' کی تبلیغ و اشاعت کرتی ہے جو مغربی سول سوسائٹی سے میل نہیں کھاتا۔ اس لحاظ سے اس مقدمے نے مسلمانوں کے سلسلے میں روس کی متضاد پالیسی کو واضح کردیا ہے جبکہ تاریخی طور پر ماسکو سے مشرق میں پانچ سو میل کے فاصلے پر وولگا ندی پر مسلم آبادی والا کزان کسی ایک سماجی لہر کی بجائے کثیر تہذیبی شہر ہے۔ میناروں کے اوپر نشان ہلال، گلٹ کے آرتھوڈوکس محرابوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف روسی شاپنگ مال، بوتک ہوٹل، بار اور نائٹ کلب اس شہر کو دوسرے رخ پر لے جارہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہاں تاتار مسلمان اس زمانے سے رہ رہے ہیں جب سولہویں صدی میں منگول امپائر سے ایوان نے یہ علاقہ چھین لیا تھا۔ وہ لوگ اپنے پڑوسی روسیوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں لیکن کچھ سیاسی عناصر اور تنگ نظر مذہبی رہنما مقامی روایات کو پامال کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو طرح طرح سے اذیتیں پہنچا رہے ہیں۔

●●

فلاح وبہبود کے لئے قابل ترجیح کون ہے؟

ہم برہمن ممبران پارلیمنٹ کی فہرست تیار کرکے انہیں استقبالیہ دینے کا پروگرام تیار کر رہے ہیں۔ آل انڈیا برہمن سبھا کے ذمے دار مہیش دت شرما نے اس خیال کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر فاؤنڈیشن کے ذمے دار سبھاش کنکھیریا کا کہنا ہے کہ ہمارا منصوبہ ہے کہ ایس سی/ایس ٹی ممبران پارلیمنٹ کو دیئے جانے والے استقبالیہ میں سشیل کمار شندے کو مہمان خصوصی بنایا جائے۔ اسی طرح دیگر ذاتوں کے لوگ بھی اپنی برادری سے تعلق رکھنے والے ممبران پارلیمنٹ کو استقبالیہ دینے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں تو کچھ اس پر عمل بھی کرچکے ہیں۔ والمیکی سبھا نے تقریباً نصف درجن اپنی کمیونٹی کے ممبران پارلیمنٹ کو استقبالیہ دیا ہے۔ تقریباً ۶۶ ممبران پارلیمنٹ راجپوت برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں بھی راجپوت برادری کے تعلق سے ایک تنظیم نے حال ہی میں استقبالیہ دیا ہے۔ کانگریس لیڈر دگ وجے سنگھ اور سماجوادی پارٹی کے قومی جنرل سکریٹری ٹھاکر امر سنگھ بھی راجپوت ہیں۔ دگ وجے سنگھ نے میٹنگ میں جو اکھل بھارتیہ چھتریہ مہاسبھا کی طرف سے منعقد کی گئی تھی، نئی دہلی میں مجوزہ چھتریہ بھون کے لئے رعایتی قیمت پر زمین فراہم کرانے کی یقین دہانی کرائی۔ ٹھاکر امر سنگھ نے بھی اس کی تعمیر کے لئے ایک کروڑ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔

یہ اس سیاست کا اگلا قدم ہے جو انتخابی مہم کے دوران کی گئی بلکہ ملک کی سیاست کی بنیاد کا نتیجہ ہے۔ موجودہ سیاست بھی ذات برادری کے گرداب سے نکلنے اور اس مزاج کو جس نے ملک کے باشندوں کو مختلف گروہوں اور ٹکڑوں میں بانٹنے اور کسی کو سر پر بٹھانے تو ملک کی بڑی آبادی کو پستی، حقارت، ذلت ورسوائی، محرومی اور ناکامی ونامرادی کے ساتھ ساتھ بھی زندگی گزارنے پر نہ صرف مجبور کردیا تھا بلکہ ملک کے ایک طبقے کو سرے سے انسان تصور کرنے سے ہی انکار کردیا تھا، بدلنے کے بجائے آج بھی اسی کی آنچ میں اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے کو ہی غنیمت جانتی ہے۔ آج کے سیاستداں یوں تو اپنے میدان کے ماہر تصور کئے جاتے ہیں، ان میں ایک بڑی تعداد عصری تعلیم سے آراستہ بھی ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور گفتگو کے دوران ذات برادری کا انکار بھی کرتے ہیں، تمام شہریوں کے لئے یکساں حقوق ومواقع کی باتیں بھی ان کی زبان سے سنی جاتی ہیں، لیکن سیاست پھر بھی اصولی طور پر ذات برادری کی بنیاد پر ہی کی جاتی ہے۔ حلقوں کے تعین سے لے کر امیدواروں کی نامزدگی، انتخابی مہم، پروپگنڈہ اور پرچار غرض ہر مرحلے میں ذات برادری کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جب الیکشن کی تقسیم ہی ذات برادری پر ہو تو پھر الیکشن کے بعد اس کا مظاہرہ تو ہوگا ہی۔ جن لوگوں نے الیکشن کے دوران اپنے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح سے محنت کی ہو وہ الیکشن کے بعد اس کا پھل ضرور لینا چاہیں گے۔ مختلف ذاتوں کے ممبران پارلیمنٹ کو دیئے جانے والے استقبالیہ کی اصل یہی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ممبران پارلیمنٹ صرف اپنی ذات وبرادری کے ہی نمائندے ہیں اور انہیں صرف ان کی برادری کے ہی لوگوں نے ووٹ دیا ہے یا یہ کہ وہ اپنے پورے حلقے کے نمائندے ہیں اور اس حلقے کے ووٹروں جن میں سب ہی شامل ہیں نے انہیں اپنا نمائندہ بنایا ہے۔ ووٹ حاصل ہونے اور الیکشن میں کامیابی کے بعد حلقے یا ذات برادری میں سے کس کی فلاح وبہبود کے لئے کوشش کی جانی چاہئے۔ بدقسمتی سے یہ رجحان بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں، بعض لوگ مسلم سماج کو بھی اسی عینک سے دیکھتے ہیں اور اس طرز پر اس کو بھی تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ ذات برادری کو ایک لعنت کہتے ہیں انہیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس رجحان کا فروغ پانا کارآمد ہے یا نقصاندہ۔

●●

لبنان میں سنی اتحاد کامیاب

بیروت۔ لبنان کے انتخابات کے سرکاری نتائج جاری ہوگئے ہیں جن کے مطابق مغرب نواز سعد حریری کی جماعت کی اکثریت برقرار رہی ہے۔ وزیر داخلہ زیدہ برود نے تصدیق کی ہے کہ سعد حریری کی زیر صدارت مخلوط اتحاد نے ۱۲۸ نشستوں میں سے ۷۱ نشستیں جیت لی ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں اس اتحاد کی نشستوں کی تعداد ستر تھی۔

شدت پسند اور سیاسی جماعت حزب اللہ نے ستاون نشستوں پر کامیابی حاصل کی ہے، پچھلے انتخاب میں بھی اس اتحاد کو اتنی ہی سیٹیں ملی تھیں۔ بین الاقوامی خبر رساں اداروں کے مطابق ملک میں قائم دوسرے سیاسی اتحاد میں شامل مشل اون کی جماعت فری پیٹریاٹ پارٹی نے اپنے اتحاد کی شکست کا اعتراف کیا ہے۔

سعد حریری نے ایک تیسری تقریر میں اپنے مدمقابل شام اور ایران کی حمایت یافتہ اتحاد پر کامیابی کا دعویٰ کیا۔ سعد حریری نے جشن مناتے اپنے حامیوں سے کہا، آپ کو مبارکباد، آزادی کو مبارکباد اور جمہوریت کو مبارکباد۔ انھوں نے کہا کہ یہ لبنان کی جمہوریت کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان انتخابات میں کسی کی ہار اور کسی کی جیت نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں جمہوریت کی فتح ہوئی ہے۔ انھوں نے مخالف اتحاد کے حامیوں سے کہا کہ وہ کسی قسم کی اشتعال انگیزی سے گریز کریں۔

لبنان میں امریکہ، مغرب اور سعودی عرب کے حمایت یافتہ اتحاد میں سعد حریری کی المستقبل پارٹی بھی شامل ہے۔ المستقبل سنی فرقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کی قیادت میں قائم اتحاد کو 'مارچ فورٹین' اتحاد کہا جاتا ہے۔ جبکہ حزب اللہ کی قیادت میں قائم اتحاد کو مصر اور ایران کی حمایت حاصل ہے اور اس میں عیسائیوں کی جماعت فری پیٹریات پارٹی بھی شامل ہے جس کے سربراہ سابق جنرل مشل اون ہیں۔ اس اتحاد کا نام 'مارچ ایٹ' ہے۔ ان انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی شرح پچاس فیصد سے زیادہ رہی۔ ملک کے دو بڑے انتخابی اتحادوں میں بعض سیٹوں پر زبردست مقابلہ دیکھنے میں آیا، لیکن انتخابات مجموعی طور پر پرامن رہے اور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر رائے شماری میں حصہ لیا۔

دعوت

۱۳ر جون ۲۰۰۹ء

مرکزی حکومت کی پالیسی

وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے صدر جمہوریہ کے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب پر ہونے والی بحث کا جواب دیتے ہوئے اپنی حکومت کی پالیسی کا خلاصہ پیش کیا اور یہ بتایا کہ ان کی حکومت آئندہ پانچ برسوں میں کیا کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے یہ بات صاف لفظوں میں بتائی کہ دہشت گردی کو کسی بھی حال میں برداشت نہیں کیا جائے گا خواہ وہ جس صورت میں بھی سر اٹھائے گی اس کے ساتھ نہ صرف یہ کہ سختی سے نمٹا جائے گا بلکہ اس کا سر کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ اس حوالے سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کی حکومت اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ اچھے دوستانہ تعلقات استوار کرنا چاہتی ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ان کی حکومت کسی کی بھی سرزمین سے ہندوستان مخالف سرگرمیوں کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرے گی اس لئے وہ اپنے پڑوسی ممالک اور خاص طور پر پاکستان کو یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ وہ اگر ہندوستان کے ساتھ اچھے دوستانہ روابط کا خواہاں ہے تو اسے چاہئے کہ اپنی سرزمین کو ہندوستان مخالف سرگرمیوں کے لئے ہرگز استعمال نہ ہونے دے اور اس نے ۲۶ر ستمبر کے بمبئی حملوں کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے ہیں اس سلسلے میں ٹھوس کارروائی کرے، اس صورت میں پاکستان کے ساتھ بات چیت شروع کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گیند اب پاکستان کے پالے میں ہے اب فیصلہ پاکستانی لیڈروں کو کرنا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اگر انھوں نے جرأتمندی اور سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور نیک نیتی سے کام کیا تو نہ صرف تعطل دور ہوجائے گا بلکہ امن وچین کے لئے راہ بھی ہموار ہوسکے گی۔ اگر انھوں نے اس کا مظاہرہ کیا تو وہ ہندوستان کو پیچھے نہیں پائیں گے وہ تو دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو تیار ہی ہے۔

انھوں نے اس پر کافی زور دے کر کہا کہ ان کی حکومت ملکی معیشت کو پٹری سے ہرگز نہیں اترنے دے گی، حالانکہ اقتصادی لحاظ سے پوری دنیا ایک شدید بحران سے گزر رہی ہے اور امریکہ سمیت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اس وقت معاشی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، ظاہر ہے اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ہے تاہم ان کی حکومت اس کی کوشش کرے گی کہ ترقی کی شرح کو گرنے نہیں دے گی بلکہ ۷،۰ فیصد کی سطح پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے گی، انھوں نے بتایا کہ ان کے سابقہ دور حکومت کے ابتدائی چار سال معاشی لحاظ سے بڑے اچھے تھے جب ترقی کی شرح ۹ فیصد تک پہنچ گئی تھی لیکن عالمی اقتصادی بحران کی وجہ سے وہ آخری سال میں گرگئی اور سات فیصد سے بھی نیچے آگئی، ان کی حکومت اس کی کوشش کرے گی کہ وہ مزید نہ گرنے پائے بلکہ اس میں سدھار ہو اور اسے ۸، ۹ فیصد تک پہنچایا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت سری لنکا کے حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے اور چاہتی ہے کہ وہاں کے تملوں کا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہوجائے، انھوں نے کہا کہ ایل ٹی ٹی ای کے خاتمے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام مسائل حل ہوگئے۔ ان کی حکومت بے گھر ہوجانے والے تمل باشندوں کی بازآبادکاری میں سری لنکا کی حکومت کی دل کھول کر مدد کرے گی، آسٹریلیا میں ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے بارے میں بھی انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ ان کی حکومت اس سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھائے گی، کوششیں شروع ہوچکی ہیں، انھوں نے حزب اختلاف کے ساتھ تعمیری انداز میں تعاون کو جاری رکھنے کا یقین دلایا، انھوں نے چین کے ساتھ ہندوستان کے مضبوط رشتوں کی بات بھی کہی۔

مسلم دنیا سے صدر اوباما کا براہ راست خطاب

''اسلام اور مغرب کے درمیان تعلق میں صدیوں کی بقائے باہمی اور تعاون شامل ہے''

گزشتہ ۴ر جون کو امریکی صدر بارک حسین اوباما مسلم دنیا سے ایک بار پھر مخاطب ہوئے، اس بار ان کی نظر انتخاب مصر پر پڑی اور جگہ تھی قاہرہ اور قاہرہ میں بھی قاہرہ یونیورسٹی۔ واضح رہے کہ انھوں نے مسلم دنیا سے اپنے پہلے خطاب کے لئے ترکی کا انتخاب کیا تھا۔ یہ فیصلہ یعنی استنبول اور قاہرہ کا انتخاب اور مسلم حکمرانوں کی بجائے عوام سے خطاب، بجائے خود نہایت اہم اور تاریخی تھا۔ دونوں خطابات میں بعض امور مشترک ہیں پھر بھی دونوں خطاب کا انداز ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے خطاب میں جہاں مسلم دنیا سے رابطے کے لئے ترکی کو واسطہ بنایا تھا وہیں اس دوسرے خطاب میں انھوں نے مسلم دنیا کو براہ راست مخاطب کیا ہے۔ البتہ دونوں میں انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے امریکہ کی کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ امن عالم کے قیام میں دونوں کی اجتماعی کوشش ضروری، مفید اور کارآمد ہوگی۔ ان کے اس دوسرے خطاب کا ترجمہ بھی امریکی سفارت خانے کے شعبۂ امور عامہ کی جانب سے بھیجا گیا ہے۔— ایڈیٹر

آپ کا بے حد شکریہ۔ گڈ آفٹر نون، میرے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میں قاہرہ کے قدیم شہر میں موجود ہوں اور دو ممتاز ادارے میری میزبانی کر رہے ہیں۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے، الازہر کو اسلامی علوم کے مینارۂ نور کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ایک صدی سے زیادہ عرصے سے قاہرہ یونیورسٹی مصر کی ترقی کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ یہ دونوں ادارے، روایت اور ترقی کا ایک حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ میں آپ کی مہمان نوازی اور مصر کے لوگوں کی مہمان نوازی کیلئے شکرگزار ہوں۔ مجھے یہ بھی فخر حاصل ہے کہ میں اپنے ساتھ امریکی عوام کے خیرسگالی کے جذبات لے کر آیا ہوں اور اپنے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے امن کا پیغام لایا ہوں: ''السلام علیکم''۔

ہم ایسے وقت مل رہے ہیں جب امریکہ اور دنیا کے مسلمانوں کے درمیان شدید کشیدگی موجود ہے۔ اس کشیدگی کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں جو آج کل کی کسی پالیسی کے بارے میں بحث تک محدود نہیں۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تعلق میں صدیوں کی بقائے باہمی اور تعاون شامل ہے۔ لیکن اس میں تصادم اور مذہبی جنگیں بھی شامل ہیں۔ حالیہ دور میں کشیدگی کو نوآبادیاتی نظام سے ہوا ملی ہے جس میں بہت سے مسلمانوں کو ان کے حقوق اور مواقع سے محروم رکھا گیا اور سرد جنگ کے دور میں مسلمان اکثریت والے بہت سے ملکوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا اور ان کی امنگوں کو سراسر نظرانداز کیا گیا۔ اس کے علاوہ، جدیدیت اور عالمگیریت کی وجہ سے جو زبردست تبدیلیاں آئیں، ان کی وجہ سے بہت سے مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ مغرب اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ متشدد انتہا پسندوں نے ان کشیدگیوں کو ایک چھوٹی سی لیکن طاقتور مسلمان اقلیت کو مشتعل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ ۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں اور ان انتہا پسندوں کی سویلین آبادی کے خلاف مسلسل تشدد کی وجہ سے میرے ملک میں بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام نہ صرف امریکہ اور مغربی ملکوں کے خلاف ہے، بلکہ وہ انسانی حقوق کا بھی مخالف ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے دونوں طرف اور زیادہ خوف اور بداعتمادی پیدا ہوئی ہے۔ جب تک ہمارے تعلق میں ہمارے اختلافات کو نمایاں مقام حاصل رہے گا، ہم ان لوگوں کو طاقتور بناتے رہیں گے جو امن کے بجائے نفرت کے بیج بوتے ہیں اور جو تعاون کے بجائے تصادم کا پرچار کرتے ہیں۔ تعاون کے ذریعے ہی ہمارے تمام لوگ انصاف اور خوشحالی حاصل کرسکتے ہیں۔ ہمیں شک وشبہ اور تنازعات کے اس چکر سے نکلنا چاہئے۔

میں امریکہ اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان ایک نئی ابتداء کی تلاش میں جو مشترکہ مفادات اور باہم احترام پر مبنی ہو، یہاں قاہرہ آیا ہوں۔ ایسی ابتداء جس کی بنیاد اس سچائی پر ہو کہ امریکہ اور اسلام ایک دوسرے کو مسترد نہیں کرتے اور ان کے درمیان مسابقت کی فضا قائم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں، ان کے درمیان تمام انسانوں کے لئے انصاف اور ترقی، رواداری اور عزت نفس کے اصول مشترک ہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تبدیلی راتوں رات نہیں آسکتی۔ میں جانتا ہوں کہ اس تقریر کی بہت تشہیر ہوئی ہے لیکن کسی ایک تقریر سے برسوں کی بداعتمادی ختم نہیں ہوسکتی، نہ ہی آج کی سہ پہر میں میرے پاس جتنا وقت ہے، اس میں، میں ان تمام پیچیدہ سوالات کے جواب دے سکتا ہوں جن کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آگے بڑھنے کے لئے ہمیں کھل کر ایک دوسرے سے وہ باتیں کہنی چاہئیں جو ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور جو ہم اکثر بند دروازوں کے پیچھے کہتے ہیں۔ ہمیں ثابت قدمی سے ایک دوسرے کی بات سننی چاہئے، ایک دوسرے سے سیکھنا چاہئے، ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہئے اور مشترکہ موقف تلاش کرنا چاہئے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں کہا گیا ہے: ''اللہ کو حاضر وناظر جانو اور ہمیشہ سچ بولو''۔ آج میں یہی کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اپنی بساط کے مطابق میں صرف سچ بولوں گا، اس احساس کے ساتھ کہ ہمارے سامنے جو کام ہے وہ بہت بڑا ہے اور اس پختہ یقین کے ساتھ کہ انسانوں کی حیثیت سے ہمارے جو مفادات مشترک ہیں، وہ ان طاقتوں کے مقابلے میں جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ اس یقین محکم کی وجہ جزوی طور پر میرا اپنا تجربہ ہے۔ میں عیسائی ہوں۔ لیکن میرے والد کا تعلق کینیا کے ایک گھرانے سے تھا جس میں مسلمانوں کی کئی نسلیں شامل تھیں۔ اپنے لڑکپن میں، میں نے انڈونیشیا میں کئی سال گزارے اور علی الصبح فجر کے وقت اور شام ڈھلے مغرب کے وقت میرے کانوں میں اذان کی آواز آتی تھی۔ نوجوانی میں، میں نے شکاگو کی بستیوں میں کام کیا، جہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں کو اپنے اسلامی دین میں تزکیہ نفس اور امن وآشتی کی دولت ملتی ہے۔ تاریخ کے طالبعلم کی حیثیت سے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انسانی تہذیب کس حد تک اسلام کی رہین منت ہے۔ الازہر یونیورسٹی جیسے اداروں میں، یہ اسلام ہی تھا جس نے صدیوں تک علم کی روشنی پھیلائی اور یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور روشن خیالی کی راہ ہموار کی۔ یہ مسلمان ملکوں میں ایجاد واختراع کی تحریک ہی تھی جس کی بدولت الجبرا کے اصول اور قاعدے دریافت ہوئے، ہمیں مقناطیسی کمپاس اور بحری جہاز رانی کے آلات ملے، ہم کو مختلف قسم کے قلم اور طباعت پر عبور حاصل ہوا اور ہمیں یہ پتہ چلا کہ بیماری کیسے پھیلتی ہے اور اس کا علاج کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی ثقافت نے ہمیں محرابیں اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مینار دیئے ہیں، ہمیں لازوال شاعری اور خوبصورت موسیقی عطا کی ہے؛ خوبصورت خطاطی اور عبادت اور غوروخوض کے پرسکون مقامات، یہ سب اسلامی ثقافت کی دین ہیں اور پوری تاریخ میں، اسلام نے اپنے قول وفعل سے مذہبی رواداری اور نسلی مساوات کے امکانات کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسلام ہمیشہ سے امریکہ کی زندگی کا حصہ رہا ہے۔ میرے ملک کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک مراکش تھا۔ ۱۷۹۶ء میں ہمارے دوسرے صدر John Adams نے معاہدہ طرابلس پر دستخط کرتے ہوئے لکھا تھا: ''امریکہ کو مسلمانوں کے قوانین، مذہب یا ان کے آرام وسکون سے کوئی عناد نہیں ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان جو اچھے تعلقات قائم ہیں، ان میں کبھی کوئی مذہبی آراء مخل نہیں ہوں گی''۔ اور ہمارے ملک کے قیام کے بعد سے اب تک، امریکی مسلمانوں نے ہمارے ملک کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے جنگیں لڑی ہیں، انھوں نے حکومت میں خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے شہری حقوق کے لئے جدوجہد کی ہے، کاروبار شروع کئے ہیں، انھوں نے ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھایا ہے، انھوں نے کھیل کے میدانوں میں کارنامے انجام دیئے ہیں، انھوں نے نوبل انعام جیتے ہیں، ہماری سب سے اونچی عمارت تعمیر کی ہے اور اولمپک مشعل روشن کی ہے۔ یہ کہانی کئی صدیوں پر محیط ہے اور اس بات کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب پہلے مسلمان امریکی حال ہی میں کانگریس کے رکن منتخب ہوئے اور انھوں نے ہمارے آئین کی حفاظت کا حلف اسی قرآن شریف پر لیا جو تھامس جیفرسن، جو ہماری مملکت کے بانیوں میں سے ہیں، اپنی لائبریری میں رکھتے تھے۔ چنانچہ اس براعظم میں آنے سے پہلے جہاں قرآن شریف نازل ہوا تھا، میں نے تین براعظموں میں اسلام سے واقفیت حاصل کی۔ اس تجربے سے میرے اس یقین کو رہنمائی ملی ہے کہ امریکہ اور اسلام کے درمیان شراکت داری کی بنیاد اس بات پر ہونی چاہئے کہ اسلام دراصل کیا ہے، نہ کہ ان چیزوں پر جو اسلام کا حصہ نہیں ہیں۔ امریکہ کے صدر کی حیثیت سے میں اسے اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں جہاں کہیں گھسے پٹے منفی خیالات پائے جاتے ہیں، ان کے خلاف جنگ کروں۔ لیکن اسی اصول کا اطلاق امریکہ کے بارے میں مسلمانوں کے خیالات پر بھی ہونا چاہئے، جس طرح سارے مسلمانوں کو کسی ایک گھسے پٹے سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا، اسی طرح امریکہ بھی کوئی ایسی مفاد پرست سامراجی سلطنت نہیں ہے جسے کسی ایک گھسے پٹے سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ ترقی کے جن عظیم ترین وسائل نے دنیا کو مالامال کیا ہے، امریکہ انہیں عظیم وسائل میں شامل ہے۔ ہمارا ملک ایک سلطنت کے خلاف انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ ہمارے قیام کی بنیاد یہ اصول تھا کہ تمام انسان برابر پیدا ہوئے ہیں اور ہم نے اپنی سرحدوں کے اندر اور دنیا بھر میں ان الفاظ کو معنی دینے کے لئے صدیوں تک جدوجہد کی ہے اور اپنا خون بہایا ہے۔ دنیا کے کونے کونے کی بہت سے ثقافتوں نے ہماری شکل متعین کی ہے اور ہم نے خود کو ایک سادہ سے تصور کے لئے وقف کردیا ہے: Eploribus Unum یعنی، بہت سوں سے مل کر ایک''۔ اس بات کو بہت اہمیت دی گئی ہے کہ ایک افریقی امریکی جس کا نام بارک حسین اوباما ہے، امریکہ کا صدر منتخب ہوا ہے۔ لیکن میری ذاتی کہانی اتنی زیادہ منفرد نہیں ہے۔ امریکہ میں سب لوگوں کے خواب تو پورے نہیں ہوئے ہیں لیکن جو لوگ بھی ہمارے ساحلوں تک پہنچے ہیں، ان سب کو برابر کے مواقع کی وعید ضرور ملی ہے اور ان میں تقریباً ۷۰ لاکھ امریکی مسلمان بھی شامل ہیں جو ہمارے ملک میں رہتے ہیں۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ ان کی آمدنی اور تعلیمی سطح، امریکہ کے اوسط سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ، امریکہ میں آزادی اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی سے الگ چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی ہر ریاست میں مسجدیں موجود ہیں اور ہماری سرحدوں کے اندر مسجدوں کی تعداد ۱۲۰۰ سے زائد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی حکومت عورتوں اور لڑکیوں کے حجاب لینے کے حق کی حفاظت کے لئے اور ان لوگوں کو سزا دینے کے لئے جو انہیں اس حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں، عدالت میں گئی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام امریکہ کا حصہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کے اندر یہ صداقت موجود ہے کہ ہماری نسل، مذہب اور زندگی میں ہمارا مقام چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہم سب کی امنگیں اور آرزوئیں مشترک ہیں۔ آزادی اور سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنا؛ تعلیم حاصل کرنا اور عزت ووقار کے ساتھ کام کرنا؛ اپنے گھرانوں، اپنی بستیوں اور اپنے خدا سے محبت کرنا۔ یہ چیزیں ہم سب میں مشترک ہیں۔ ساری انسانیت کی امید یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے مشترکہ انسانی ورثے کو تسلیم کرنے سے، ہمارا کام ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ یہ تو محض ابتداء ہے۔ صرف الفاظ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ یہ ضرورتیں اسی صورت میں پوری ہوسکتی ہیں اگر ہم آنے والے برسوں میں ہمیں جرأت کے ساتھ اقدامات کریں اور ہم یہ بات سمجھیں کہ دنیا بھر کے لوگوں کے ایک جیسے مسائل درپیش ہیں اور اگر ہم ان سے نمٹنے میں ناکام رہے تو اس سے ہم سب کو نقصان ہوگا۔ ہم نے حالیہ تجربوں سے سیکھا ہے کہ جب مالیاتی نظام ایک ملک میں کمزور ہوتا ہے تو ہر جگہ خوشحالی پر برا اثر پڑتا ہے۔ جب کسی ایک انسان کو نئے قسم کے فلو کا انفکشن ہوتا ہے تو سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ جب ایک ملک نیوکلیئر ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو تمام ملکوں کے لئے نیوکلیئر حملے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ جب متشدد انتہا پسند پہاڑوں کے ایک حصے میں کارروائیاں کرتے ہیں تو سمندر پار رہنے والوں کے لئے خطرہ پیدا ہوجاتا ہے اور جب دارفر اور بوسنیا میں بے گناہ لوگ قتل کئے جاتے ہیں تو یہ ہم سب کے اجتماعی ضمیر پر کلنک کا ٹیکہ ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں دنیا میں مشترکہ ذمے داری کا مطلب یہی ہے۔ انسانوں کی حیثیت سے ہم اس طرح ایک دوسرے کیلئے ذمے دار ہیں۔ اس ذمے داری کو گلے لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں ملکوں اور قبیلوں اور مذاہب نے اپنے مفادات کی خاطر ایک دوسرے کو غلام بنایا ہے، لیکن اس نئے دور میں، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ چونکہ تمام ملک ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں، اس لئے کوئی بھی عالمی نظام جس کے تحت ایک ملک یا لوگوں کا ایک گروپ دوسرے پر حاوی ہوجاتا ہے، بالآخر ناکام ہوجائے گا۔

چنانچہ ہم ماضی کے بارے میں جو بھی سوچیں، ہمیں اس کا قیدی نہیں بننا چاہئے۔ ہمیں اپنے مسائل شراکت داری سے حل کرنے چاہئیں اور ہماری ترقی میں سب کا حصہ ہونا چاہئے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں کشیدگی کے اسباب کو نظرانداز کردینا چاہئے بلکہ ہمارا رویہ اس کے برعکس ہونا چاہئے۔ ہمیں ان وجوہ کا جرأت کے ساتھ سامنا کرنا چاہئے۔ اس جذبے کے تحت، میں کچھ ایسے مخصوص مسائل کے بارے میں بالکل صاف بات کرنا چاہتا ہوں جن کا سامنا ہمیں مل جل کر کرنا ہے۔ پہلا مسئلہ جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے، وہ تمام شکلوں میں، پرتشدد انتہا پسندی ہے۔ انقرہ میں، میں نے یہ بات واضح کردی تھی کہ امریکہ اسلام کے ساتھ حالت جنگ میں نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا ہوگا۔ تاہم، ہم ان متشدد انتہا پسندوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے جو ہماری سیکورٹی کے لئے سنگین خطرہ بنیں گے۔ کیونکہ ہم بھی ان تمام چیزوں کو مسترد کرتے ہیں جنہیں تمام مذاہب کے ماننے والے مسترد کرتے ہیں، یعنی بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا اور صدر کی حیثیت سے میرا پہلا فرض امریکیوں کی حفاظت ہے۔ افغانستان میں جو صورتحال ہے اس سے امریکہ کے مقاصد اور ہمارے ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی ضرورت، دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ سات سال سے زیادہ ہوئے کہ امریکہ نے وسیع بین الاقوامی حمایت کے ساتھ، القاعدہ اور طالبان کا پیچھا کیا۔ ہم نے اس راہ کا انتخاب خود نہیں کیا۔ ہمیں ایسا مجبوراً کرنا پڑا۔ میں جانتا ہوں کہ اب بھی کچھ لوگوں کے ذہن میں نائن الیون کے واقعات کے بارے میں سوالات ہیں بلکہ کچھ لوگ ان کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔ القاعدہ نے ۱۱ رستمبر ۲۰۰۱ء کو تقریباً تین ہزار افراد ہلاک کردیئے۔ ہلاک ہونے والے مرد، عورتیں اور بچے، بے گناہ تھے۔ ان میں امریکی تھے اور دوسرے بہت سے ملکوں کے لوگ تھے جنھوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ لیکن اس کے باوجود القاعدہ نے ان لوگوں کو بلادریغ ہلاک کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے یہ حملہ کیا ہے۔ القاعدہ نے بار بار اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ پھر بڑے پیمانے پر قتل کرے گی۔ بہت سے ملکوں میں ان کی ذیلی تنظیمیں موجود ہیں اور وہ اپنی رسائی کو وسعت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کسی کی ذاتی آرا نہیں ہیں جن پر بحث کی جائے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا سامنا ہمیں کرنا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم افغانستان میں اپنی فوجیں رکھنا نہیں چاہتے۔ ہمیں وہاں فوجی اڈے نہیں چاہئیں۔ اپنے نوجوان مردوں اور عورتوں سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہمارے لئے بڑا تکلیف دہ ہے۔ اس جنگ کو جاری رکھنا بہت مہنگا اور سیاسی طور پر بہت مشکل کام ہے۔ ہم بخوشی اپنے تمام فوجیوں کو واپس لے آئیں گے اگر ہمیں یہ اطمینان ہو کہ افغانستان میں اور اب پاکستان میں ایسے متشدد انتہا پسند موجود نہیں ہیں جو زیادہ سے زیادہ امریکیوں کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن اب تک ایسا ہوا نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے ۴۶ ملکوں کے اتحاد کے ساتھ شراکت داری قائم کی ہے اور بھاری قیمت کے باوجود، امریکہ کا عزم کمزور نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو بھی ان انتہا پسندوں کو برداشت نہیں کرنا چاہئے۔ انھوں نے بہت سے ملکوں میں لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ہلاک کیا ہے اور ہلاک ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ان کی کارروائیاں انسانوں کے حقوق، ملکوں کی ترقی، اور اسلام کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی کسی بے گناہ انسان کو قتل کرتا ہے، وہ گویا پوری انسانیت کا قاتل ہے اور قرآن شریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کوئی کسی انسان کی جان بچاتا ہے، اس نے گویا پوری انسانیت کی جان بچائی ہے۔ ایک ارب لوگوں سے زیادہ لوگوں کا یہ خوبصورت دین، تنگ نظری پر مبنی چند لوگوں کی نفرت سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ متشدد انتہا پسندوں کے خاتمے میں اسلام کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہ تو امن کے فروغ کا اہم ذریعہ ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ صرف فوجی طاقت سے افغانستان اور پاکستان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اگلے پانچ برسوں کے دوران، ہر سال $1.5 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کریں گے اور پاکستانیوں کی شراکت داری میں اسکول اور ہسپتال، سڑکیں اور کاروباری ادارے تعمیر کریں گے اور اپنے گھروں سے بے دخل ہوجانے والوں کی مدد کے لئے کروڑوں ڈالر دیں گے اور یہی وجہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کو $2.8 ارب ڈالر سے زیادہ امداد دے رہے ہیں تاکہ وہ اپنی معیشت کو ترقی دے سکیں اور وہ سہولتیں فراہم کرسکیں جن پر لوگوں کا انحصار ہے۔ میں عراق کے مسئلے پر بھی بات کرنا چاہوں گا۔ افغانستان کے برعکس، عراق کی جنگ ہم نے اپنی مرضی سے شروع کی تھی۔ اس جنگ کی وجہ سے میرے ملک میں اور دنیا بھر میں شدید اختلافات کو ہوا ملی۔ اگرچہ میرا خیال یہ ہے کہ عراق کے عوام صدام حسین کی بربریت سے نجات پاچکے ہیں اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہے، میرا یہ بھی خیال ہے کہ عراق کے واقعات سے امریکہ کو یہ سبق ملا ہے کہ جب بھی ممکن ہو، ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لئے سفارتکاری کو استعمال کرنا چاہئے اور بین الاقوامی اتفاق رائے حاصل کرنا چاہئے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم اپنے ایک عظیم صدر، تھامس جیفرسن کے الفاظ یاد کرسکتے ہیں جنھوں نے کہا تھا: ''مجھے امید ہے کہ طاقت کے ساتھ ساتھ، ہماری عقل و دانش میں اضافہ ہوگا اور ہم یہ سیکھیں گے کہ ہم اپنی طاقت کو جتنا کم استعمال کریں گے، اتنا ہی اس طاقت میں اضافہ ہوگا''۔ آج امریکہ پر دہری ذمے داری عائد ہوتی ہے: بہتر مستقبل کی تعمیر میں عراق کی مدد کرنا اور عراق کو عراقیوں کے حوالے کرنا اور میں نے یہ بات عراق کے لوگوں کو صاف طور پر بتا دی ہے۔ میں نے عراقی عوام پر واضح کردیا ہے کہ ہم وہاں کوئی اڈے نہیں چاہتے اور ان کے علاقے یا وسائل پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ عراق کے اقتدار اعلیٰ پر وہاں کے عوام کا اختیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اگلے سال اگست تک، وہاں سے اپنے جنگی بریگیڈ نکالنے کا حکم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عراق کی جمہوری طور پر منتخب حکومت کے ساتھ اپنے سمجھوتے کی پابندی کریں گے اور عراق کے شہروں سے اپنے لڑاکا فوجی جولائی تک اور ۲۰۱۲ء تک اپنی تمام فوجیں نکال لیں گے۔ ہم عراق کی سیکورٹی فورسز کی تربیت میں مدد دیں گے اور اس کی معیشت کو ترقی دیں گے۔ لیکن ہم ایک محفوظ اور متحد عراق کی مدد ایک شراکت دار کی حیثیت سے کریں گے، مربی کی طرح کبھی نہیں۔ اور آخری بات یہ ہے کہ جس طرح امریکہ کبھی بھی انتہا پسندوں کا تشدد برداشت نہیں کرسکتا، اسی طرح ہمیں کبھی اپنے اصول تبدیل یا فراموش نہیں کرنے چاہئیں۔ نائن الیون ہمارے ملک کے لئے ایک عظیم صدمہ تھا۔ اس کی وجہ سے خوف اور ناراضگی پیدا ہونے کی بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن بعض صورتوں میں اس کی وجہ سے ہم نے کچھ ایسے اقدام کئے جو ہماری روایات اور ہمارے اصولوں کے خلاف تھے۔ ہم اپنی راہ تبدیل کرنے کیلئے ٹھوس اقدامات کر رہے ہیں۔ میں نے صاف طور پر امریکہ کی طرف سے اذیت رسانی کا استعمال ممنوع قرار دے دیا ہے اور میں نے حکم دیا ہے کہ گوانتاناموبے کے قیدخانے کو اگلے سال کے شروع تک بند کردیا جائے۔ چنانچہ امریکہ اپنا دفاع کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کے اقتدار اعلیٰ اور قانون کی حکمرانی کا احترام کرے گا اور ہم یہ سب مسلمان کمیونٹیوں کی شراکت داری کے ساتھ کریں گے جو خود بھی خطرے میں ہیں۔ جتنی جلدی انتہا پسند الگ تھلگ کردیئے جائیں گے اور مسلمان بستیوں میں ناپسندیدہ قرار دے دیئے جائیں گے، اتنی ہی جلدی ہم سب محفوظ ہوجائیں گے۔ کشیدگی کی دوسری بڑی وجہ جس پر ہمیں بات کرنی چاہئے وہ اسرائیلیوں، فلسطینیوں اور عرب دنیا کے درمیان تعلقات کی صورتحال ہے۔

اسرائیل کے ساتھ امریکہ کے مضبوط رشتوں کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ یہ رشتہ ناقابل تنسیخ ہے۔ اس کی بنیاد ثقافتی اور تاریخی بندھنوں پر، اور اس احساس پر ہے کہ یہودیوں کی ایک وطن کی آرزو کی بنیاد ایک المناک تاریخ پر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر میں یہودی عوام پر صدیوں تک ظلم کئے جاتے رہے اور یورپ میں یہود دشمنی کا انجام نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کی صورت میں نکلا جسے ہولوکاسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ کل میں Buchenwald جاؤں گا جو ان کیمپوں کے نیٹ ورک کا حصہ تھا جہاں یہودیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، انہیں اذیتیں دی جاتی تھیں، انہیں گولی ماری جاتی تھی اور زہریلی گیس سے موت کی نیند سلا دیا جاتا تھا۔ ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہلاک کیا گیا۔ یہ تعداد آج کے اسرائیل کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا بے بنیاد بات ہے اور ناواقفیت اور نفرت پر مبنی ہے۔ اسرائیل کو تباہی کی دھمکی دینا یا یہودیوں کے بارے میں گھسی پٹی گمراہ کن باتیں دہرانا، سراسر غلط ہے۔ ایسی باتوں سے اسرائیلیوں کے ذہن میں تکلیف دہ واقعات کی یاد تازہ ہوتی ہے اور امن کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جس کے اس علاقے کے لوگ مستحق ہیں۔ دوسری طرف، اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فلسطین کے لوگوں نے، جن میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل ہیں، اپنے وطن کی حصول کی راہ میں بڑے مصائب برداشت کئے ہیں۔ ساٹھ برس سے زیادہ عرصے سے انھوں نے بے گھر ہونے کی اذیت برداشت کی ہے۔ بہت سے لوگ مغربی کنارے کے پناہ گزیں کیمپوں میں، غزہ میں اور آس پاس کے علاقوں میں امن وسلامتی کی ایسی زندگی کے انتظار میں ہیں جو انہیں کبھی نہیں مل سکی۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی چھوٹی بڑی ذلتیں برداشت کرتے ہیں جو غیرملکی قبضے کے ساتھ آتی ہیں۔ چنانچہ اس بات میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ فلسطینی عوام کی صورتحال ناقابل برداشت ہے۔ امریکہ ایک باوقار اور مواقع سے بھرپور زندگی اور اپنی ایک مملکت کے لئے فلسطینیوں کی جائز امنگوں سے منہ نہیں موڑے گا۔ کئی عشروں سے تعطل کی کیفیت جاری ہے۔ دونوں علاقوں کے عوام، جن میں سے ہر ایک کی تکلیف دہ تاریخ ہے جس کی وجہ سے مصالحت مشکل ہوگئی ہے۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی آسان ہے۔ فلسطینی کہتے ہیں کہ اسرائیل کے قیام کی وجہ سے انہیں اپنے گھربار چھوڑنے پڑے اور اسرائیلی کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ میں مسلسل اس کی سرحدوں کے اندر اور باہر سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس تنازعے کو صرف کسی ایک رخ سے دیکھیں تو ہم سچ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ حل صرف یہی ہے کہ دونوں فریقوں کی امنگیں دو مملکتوں کے قیام کے ذریعے پوری ہوں، جن میں اسرائیلی اور فلسطینی امن اور سلامتی میں زندگی گزار سکیں۔ یہ بات اسرائیل کے مفاد میں ہے، فلسطین کے مفاد میں ہے اور امریکہ کے مفاد میں ہے اور دنیا کے مفاد میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ذاتی طور پر اس نتیجے کے حصول کے لئے کوشش کروں گا، چاہے اس کے لئے کتنا ہی صبر درکار کیوں نہ ہو۔ روڈمیپ کے تحت فریقین نے جو ذمے داریاں پوری کرنے کا عہد کیا ہے، وہ واضح ہیں۔ امن کی خاطر، ان کے لئے اور ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی ذمے داریاں پوری کریں۔ فلسطینیوں کو تشدد ترک کرنا چاہئے، تشدد اور ہلاکتوں کے ذریعے مزاحمت غلط ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ صدیوں تک، امریکہ میں سیاہ فام لوگ غلاموں کی حیثیت سے کوڑوں کی تکلیف اور نسلی امتیاز کی اذیتیں برداشت کرتے

باقی صفحہ ۵ پر

میں امریکہ اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان ایک نئی ابتداء کی تلاش میں جو مشترکہ مفادات اور باہم احترام پر مبنی ہو، یہاں قاہرہ آیا ہوں۔ ایسی ابتداء جس کی بنیاد اس سچائی پر ہو کہ امریکہ اور اسلام ایک دوسرے کو مسترد نہیں کرتے اور ان کے درمیان مسابقت کی فضا قائم ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں، ان کے درمیان تمام انسانوں کے لئے انصاف اور ترقی، رواداری اور عزت نفس کے اصول مشترک ہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تبدیلی راتوں رات نہیں آسکتی۔ میں جانتا ہوں کہ اس تقریر کی بہت تشہیر ہوئی ہے لیکن کسی ایک تقریر سے برسوں کی بداعتمادی ختم نہیں ہوسکتی، نہ ہی آج کی سہ پہر میں میرے پاس جتنا وقت ہے، اس میں، میں ان تمام پیچیدہ سوالات کے جواب دے سکتا ہوں جن کی وجہ سے ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آگے بڑھنے کے لئے ہمیں کھل کر ایک دوسرے سے وہ باتیں کہنی چاہئیں جو ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور جو ہم اکثر بند دروازوں کے پیچھے کہتے ہیں۔ ہمیں ثابت قدمی سے ایک دوسرے کی بات سننی چاہئے، ایک دوسرے سے سیکھنا چاہئے، ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہئے اور مشترکہ موقف تلاش کرنا چاہئے۔

اسرائیل کے ساتھ امریکہ کے مضبوط رشتوں کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ یہ رشتہ ناقابل تنسیخ ہے۔ اس کی بنیاد ثقافتی اور تاریخی بندھنوں پر، اور اس احساس پر ہے کہ یہودیوں کی ایک وطن کی آرزو کی بنیاد ایک المناک تاریخ پر ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر میں یہودی عوام پر صدیوں تک ظلم کئے جاتے رہے اور یورپ میں یہود دشمنی کا انجام نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کی صورت میں نکلا جسے ہولوکاسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ کل میں Buchenwald جاؤں گا جو ان کیمپوں کے نیٹ ورک کا حصہ تھا جہاں یہودیوں کو غلام بنایا جاتا تھا، انہیں اذیتیں دی جاتی تھیں، انہیں گولی ماری جاتی تھی اور زہریلی گیس سے موت کی نیند سلا دیا جاتا تھا۔ ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ہلاک کیا گیا۔ یہ تعداد آج کے اسرائیل کی کل آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا بے بنیاد بات ہے اور ناواقفیت اور نفرت پر مبنی ہے۔ اسرائیل کو تباہی کی دھمکی دینا یا یہودیوں کے بارے میں گھسی پٹی گمراہ کن باتیں دہرانا، سراسر غلط ہے۔ ایسی باتوں سے اسرائیلیوں کے ذہن میں تکلیف دہ واقعات کی یاد تازہ ہوتی ہے اور امن کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جس کے اس علاقے کے لوگ مستحق ہیں۔

بقیہ: ''اسلام اور مغرب کے درمیان تعلق میں صدیوں کی بقائے باہمی اور تعاون شامل ہے''

رہے۔ لیکن انھوں نے مکمل اور برابر کے حقوق تشدد کے ذریعے حاصل نہیں کئے۔ اس کے لئے انھوں نے پرامن طریقے سے اور پورے عزم کے ساتھ امریکہ کے بانیوں کے اصولوں پر اصرار کیا۔ یہی کہانی جنوبی افریقہ سے لے کر جنوبی ایشیا اور مشرقی یورپ سے لے کر انڈونیشیا کے عوام بھی دہرا سکتے ہیں۔ اس کہانی کی بنیاد ایک سادہ سچائی پر قائم ہے۔ تشدد ایک بند گلی ہے۔ یہ بہادری یا طاقت نہیں کہ محو خواب بچوں پر راکٹ داغے جائیں، یا بس میں سوار بوڑھی عورتوں کو دھماکے سے اڑا دیا جائے۔ اس طرح اخلاقی جواز حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس طرح اخلاقی جواز گنوایا جاتا ہے۔ فلسطینیوں کے لئے وقت آ گیا ہے کہ وہ اس بات پر توجہ مرکوز کریں کہ وہ کیا تعمیر کرسکتے ہیں۔ فلسطینی انتظامیہ کو خود حکومت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی اور ایسے ادارے قائم کرنے ہوں گے جو اس کے عوام کی ضروریات پوری کرسکیں۔ حماس کو کچھ فلسطینیوں کی حمایت حاصل ہے، لیکن اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کے اوپر ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ فلسطینیوں کی امنگوں کے حصول کے لئے اور فلسطینیوں کو متحد کرنے کے لئے حماس کو تشدد ترک کرنا ہوگا اور اسرائیل کے حق وجود کو تسلیم کرنے کے سابقہ معاہدوں کو رد کرنے کے وطیرے سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے ساتھ اسرائیل کو بھی یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ جس طرح اسرائیل کا حق وجود جھٹلایا نہیں جاسکتا، ویسے ہی فلسطینیوں کو بھی یہی حق حاصل ہے۔ امریکہ ان لوگوں کا استحقاق تسلیم نہیں کرتا جو اسرائیل کو سمندر میں دھکیل دینا چاہتے ہیں، تاہم ہم اسرائیل کی طرف سے مسلسل نئی آبادیاں بسائے چلے جانے کے استحقاق کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تعمیرات سابقہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرتی ہیں اور امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان تعمیرات کو روک دیا جائے۔ اسرائیل کو ہر صورت ان معاہدوں کی پاسداری کرنا ہوگی جن کے تحت فلسطینی جی سکیں، کام کرسکیں اور اپنا معاشرہ تعمیر کرسکیں اور بالکل ایسے ہی جیسے غزہ میں مسلسل جاری انسانی بحران فلسطینیوں کو دہلا کر رکھ دیتا ہے، ویسے ہی یہ اسرائیل کے تحفظ میں بھی حائل ہوتا ہے اور نہ ہی مغربی کنارے میں مواقع کا فقدان اسرائیل کے حق میں جاتا ہے۔ فلسطینیوں کی روزمرہ زندگی میں ترقی امن کی شاہراہ کا حصہ ہونی چاہئے اور اسرائیل کو اس ترقی کو ممکن بنانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ آخر میں عرب ممالک کو یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ امن کا عرب منصوبہ ایک اچھا آغاز تھا، تاہم ان کی ذمے داریاں اسی پر ختم نہیں ہو جاتیں۔ عرب اسرائیل تنازعے کو عرب شہریوں کی دوسرے مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے مزید استعمال نہیں کیا جانا چاہئے۔ اس کے برعکس اس تنازعے کو فلسطینیوں کو ریاستی ادارے تعمیر کرنے میں مدد دینے کے لئے بروئے کار لانا چاہئے۔ اس تنازعے کو اسرائیل کے استحقاق کو تسلیم کرنے اور ماضی پر شکست خوردانہ توجہ کی بجائے ترقی کو ترجیح دینے کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔

امریکہ اپنی پالیسیاں ان کے ساتھ مربوط کرے گا جو امن کے متلاشی ہیں اور وہ جو باتیں سرعام کرتا ہے، وہی اسرائیلیوں، فلسطینیوں اور عربوں کے ساتھ خلوت میں بھی کہے گا۔ ہم زبردستی امن نافذ نہیں کرسکتے، لیکن بہت سے عرب خلوت میں بھی کہتے ہیں کہ اسرائیل کہیں جائے گا نہیں۔ اسی طرح بہت سے اسرائیلی فلسطینی ریاست کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے وقت ہے کہ اس بات پر عمل کریں جس کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ سچ ہے۔ بہت سے آنسو بہائے جا چکے ہیں۔ بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ یہ ہم سب کی ذمے داری ہے کہ اس دن کے لئے کام کریں جب اسرائیلی اور فلسطینی مائیں اپنے بچوں کو بغیر کسی خوف کے پروان چڑھتا دیکھ سکیں، جب تین عظیم مذاہب کی ارض مقدس امن کی وہ سرزمین بن جائے جیسی خدا چاہتا تھا، جب یروشلم یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ اور ابدی مقام بن جائے۔ ایک ایسی جگہ جہاں آل ابراہیم اسرا (ISRA) کے اس قصے کی مانند امن و آشتی سے اکٹھے ہوں، جب موسیٰ عیسیٰ اور محمد (علیہ السلام) نے مل کر دعا کی تھی۔ تناؤ کی تیسری وجہ ان اقوام کے حقوق اور فرائض میں ہمارا مشترکہ مفاد ہے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ یہی قضیہ امریکہ اور اسلامی جمہوریہ ایران کے درمیان حالیہ تناؤ کا باعث رہا ہے۔ کئی برسوں سے ایران نے میرے ملک کی مخالفت میں اپنی شناخت بنا رکھی ہے اور بے شک ہم دونوں کے درمیان ہنگامہ خیز تاریخ موجود ہے۔ سرد جنگ کے دوران امریکہ نے ایران میں ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے میں کردار ادا کیا تھا۔ اسلامی انقلاب کے بعد ایران نے یرغمال بنانے اور امریکی فوجیوں اور شہریوں کے خلاف تشدد میں کردار ادا کیا ہے۔ یہ تاریخ سب کو معلوم ہے۔ تاہم ماضی میں مقید رہنے کی بجائے میں نے ایرانی رہنماؤں اور عوام پر یہ واضح کردیا ہے کہ میرا ملک آگے بڑھنے کے لئے تیار ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ ایران کس چیز کے خلاف ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے لئے کیسا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ میں یہ بات سمجھتا ہوں کہ عشروں کے عدم اعتماد پر قابو پانا مشکل ہوگا، لیکن ہم جرأت، راست بازی اور عزم کے ساتھ پیش قدمی کریں گے۔ دونوں ممالک کے درمیان کئی معاملات پر تبادلہ خیال ہوگا اور ہم بغیر پیشگی شرائط باہمی احترام کی بنا پر آگے بڑھنے کے لئے آمادہ ہیں۔ تاہم یہ بات ان سب پر واضح ہے جو ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں فکرمند ہیں کہ ہم ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ محض امریکہ کے مفاد کے بارے میں نہیں ہے، یہ مشرق وسطیٰ میں اسلحے کی اس خطرناک دوڑ کو روکنے کے بارے میں ہے جو ایک طرف تو اس خطے کو ایک بیحد خطرناک راستے پر دھکیل دے گی تو دوسری طرف عالمی عدم پھیلاؤ کے قوانین کو بھی تہس نہس کردے گی۔ میں ان لوگوں کا موقف سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ کچھ ممالک کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے اور کچھ کے پاس نہیں۔ کسی واحد ملک کو یہ اختیار نہیں ہونا چاہئے کہ کون سے ممالک کے پاس ایٹمی اسلحہ ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس امریکی اقرار کا اعادہ کرتا ہوں جس کے تحت ایک ایسی دنیا کی جستجو کی جائے گی جہاں کسی ملک کے پاس بھی ایٹمی ہتھیار نہ ہوں اور ہر ملک کو، بشمول ایران، عدم پھیلاؤ کے معاہدے کے تحت پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے حصول کا حق ہو۔ یہ اقرار اس معاہدے کی بنیاد ہے اور سب کو اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ علاقے کے تمام ملک اس مقصد میں شریک ہوسکتے ہیں۔ چوتھا مسئلہ جس پر میں بات کرنا چاہتا ہوں وہ جمہوریت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حالیہ برسوں میں جمہوریت کے فروغ کے بارے میں اختلافات رہے ہیں اور ان اختلافات کو زیادہ ترجسے کا تعلق عراق میں جنگ سے ہے۔ چنانچہ میں واضح الفاظ میں کہتا ہوں: کسی ملک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے ملک پر کوئی نظام حکومت مسلط کرے۔ تاہم اس سے میرا ان حکومتوں کے لئے عزم کم نہیں ہوتا جو اپنے عوام کی خواہشات کی آئینہ دار ہیں۔ ہر قوم اس اصول پر اپنے اپنے طریقے اور اپنے عوام کی روایات کے مطابق عمل پیرا ہوتی ہے۔ امریکہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ وہ یہ جانتا ہے کہ سب کے لئے کیا اچھا ہے، ایسے ہی جیسے ہم کسی پرامن انتخابات کے نتائج کا پہلے سے اعلان نہیں کرنا چاہتے۔ تاہم میرا یہ اٹل ایمان ہے کہ تمام انسان چند چیزیں چاہتے ہیں: اپنی رائے کا اظہار کرنے اور اپنا نظام حکومت منتخب کرنے کی آزادی، قانون کی بالادستی اور انصاف کے یکساں اطلاق پر اعتماد، ایک ایسی حکومت کی خواہش جو شفاف ہو اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ نہ ڈالے اور اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی۔ یہ محض امریکی نظریات نہیں ہیں، یہ انسانی حقوق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ہر جگہ ان کی پشت پناہی کریں گے۔ اس عہد کی تکمیل کے لئے کوئی ایک سیدھا راستہ نہیں ہے تاہم یہ ضرور واضح ہے کہ انجام کار وہی حکومتیں زیادہ مستحکم، کامیاب اور محفوظ ہوتی ہیں جو ان حقوق کا تحفظ کرتی ہیں۔ نظریات کچلنے سے ختم نہیں ہوا کرتے۔ امریکہ دنیا بھر کی تمام امن پسند اور قانون پسند آوازوں کا احترام کرتا ہے، چاہے ہمیں ان سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو اور ہم تمام منتخب اور پرامن حکومتوں کا خیر مقدم کریں گے، بشرطیکہ وہ حکومت کرتے وقت اپنے تمام لوگوں کا احترام کریں۔ آخری نکتہ اس لئے ضروری ہے کہ کچھ لوگ جمہوریت کی صرف اس وقت حمایت کرتے ہیں جب وہ اقتدار سے باہر ہوں۔ اقتدار میں آنے کے بعد وہ بڑی بے دردی سے دوسرے کے حقوق سلب کرتے ہیں۔ چاہے وہ جہاں بھی جڑ پکڑیں، عوام کی عوام کی خاطر بننے والی حکومتیں تمام برسراقتدار لوگوں کے لئے ایک ہی معیار مقرر کرتی ہیں: آپ کو اپنا اقتدار جبر کے ذریعے نہیں بلکہ عوام کی مرضی سے برقرار رکھنا چاہئے، آپ کو اقلیتوں کے حقوق کا احترام کرنا چاہئے اور رواداری اور مصالحت کے جذبے کے ساتھ حکومت میں شرکت کرنی چاہئے، آپ کو عوام کے مفاد کو اور جائز سیاسی عمل کو، اپنی جماعت کے مفاد پر ترجیح دینی چاہئے۔ اگر یہ تمام اجزاء موجود نہ ہوں تو صرف انتخابات سے صحیح جمہوریت وجود میں نہیں آ سکتی۔ حاضرین میں موجود ایک شخص: بارک حسین اوباما، ہم تم سے پیار کرتے ہیں! صدر اوباما: شکریہ۔

پانچواں مسئلہ جسے ہم سب کو مل کر حل کرنا ہے، وہ ہے مذہبی آزادی۔ اسلام میں رواداری کی ایک پروقار روایت موجود ہے۔ ہمیں یہ روایت اندلس اور قرطبہ کی تاریخ میں Inquisition کے دور میں نظر آتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انڈونیشیا میں اس کا مظاہرہ دیکھا ہے جہاں مسلم اکثریتی ملک میں عیسائی آزادی سے عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کی آج ہمیں ضرورت ہے۔ ہر ملک کے لوگوں کو اپنی زندگیاں اپنے مذہب کی بنیاد پر، اپنے دل و دماغ اور روح کی آواز کے مطابق، بسر کرنے کی آزادی ہونی چاہئے۔ یہ آزادی مذہب کے پروان چڑھنے کے لئے لازمی ہے، لیکن یہ آزادی مختلف طریقوں سے خطرے سے دوچار ہے۔ بعض مسلمانوں میں یہ پریشان کن رجحان موجود ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی پیمائش دوسروں کے عقائد کو رد کر کے کرتے ہیں۔ مذہبی تنوع کی رنگارنگی کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہئے، چاہے وہ لبنان کے میرونائٹ (Maronite) ہوں یا مصر کے قبطی (Copt)۔ اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی دراڑیں بھی ضرور بند ہونی چاہئیں، جیسا کہ خصوصاً عراق میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان تفرقے نے المناک تشدد کو جنم دیا ہے۔ مذہبی آزادی لوگوں کے مل جل کر رہنے کی صلاحیت کا بنیادی وصف ہے۔ ہمیں ہر حال میں ایسے طریقوں کا تجزیہ کرتے رہنا ہوگا جن کے تحت اس آزادی کا تحفظ کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں خیرات پر عائد قوانین نے مسلمانوں کے لئے اپنی مذہبی فرائض پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں امریکی مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے عزم پر راسخ ہوں کہ وہ زکوٰۃ دے سکیں۔ اسی طرح، مغربی ممالک کے لئے یہ اہم ہے کہ وہ مسلمان شہریوں پر اپنی مرضی کے مطابق اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے سے روکنے سے گریز کریں، مثال کے طور پر یہ حکم لاگو کرنا کہ مسلمان عورتوں کو کس قسم کا لباس پہننا چاہئے۔ سادہ الفاظ میں، ہم کسی مذہب کی طرف عناد کو ترقی پسندی کی آڑ میں نہیں چھپا سکتے۔ ہونا یہ چاہئے کہ مذہب ہمیں قریب لائے۔ اسی لئے ہم امریکہ میں ایسے منصوبے شروع کررہے ہیں جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو قریب لائیں گے۔ اسی لئے ہم شاہ عبداللہ کے بین المذاہبی مکالمے اور ترکی کی قیادت کی طرف سے تہذیبوں کے اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہم مکالمے کو بین المذاہب خدمات میں تبدیل کرسکتے ہیں، تاکہ لوگوں کے درمیان پل تعمیر ہوں جو انہیں عمل پر راغب کریں، چاہے وہ افریقہ میں ملیریا کا سدباب ہو یا کسی قدرتی آفت کے بعد امدادی کارروائیاں۔ چھٹا مسئلہ جس پر میں بات کرنا چاہتا ہوں، وہ عورتوں کے حقوق ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی ہے اور یہاں حاضرین کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مسئلے پر بہت اچھی بحث جاری ہے۔ میں مغرب میں بعض لوگوں کے اس نظریے کو مسترد کرتا ہوں کہ وہ عورت جو اپنے بال چھپاتی ہے، وہ مساوی نہیں ہے، لیکن میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ وہ عورت جس پر تعلیم کے دروازے بند کردیئے جائیں وہ بھی مساوی نہیں ہے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ان ممالک کے خوشحال ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جہاں عورتیں پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ مجھے اس معاملے پر صاف گوئی سے کام لینے کی اجازت دیں: خواتین کی مساوات کا مسئلہ صرف اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے ترکی، پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا جیسے مسلم اکثریتی ملکوں میں دیکھا ہے کہ انھوں نے خواتین رہنماؤں کو منتخب کیا ہے۔ اسی دوران امریکہ اور دنیا بھر میں زندگی کے بعض شعبوں میں خواتین کی مساوات کی جدوجہد اب بھی جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری بیٹیاں ہمارے معاشرے کے لئے اتنی ہی کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں جتنے ہمارے بیٹے۔ ہماری مشترکہ خوشحالی اسی صورت میں پیش قدمی کرسکتی ہے جب مرد عورت سمیت تمام انسانیت کو اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کا موقع دیا جائے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ خواتین برابری کے لئے مردوں ہی کی طرح کے فیصلے کریں اور میں ان خواتین کا احترام کرتا ہوں جو اپنی زندگیاں روایتی طریقے سے گزارنا چاہتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی اپنی مرضی پر منحصر ہونا چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کسی بھی ایسے مسلم اکثریت والے ملک کے ساتھ شراکت داری کرنا چاہتا ہے جو لڑکیوں کی تعلیم اور نوجوان خواتین کو چھوٹے قرضوں کے ذریعے اپنے خوابوں کی تعبیر دلوانے کے لئے تیار ہو۔ اور آخر میں، میں معاشی ترقی اور مواقع کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سوں کے لئے عالم گیریت باہم متضاد مظہر ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹی وی معلومات کے ساتھ ساتھ گھروں میں قابل اعتراض جنسیت اور بے معنی تشدد بھی لائے ہیں۔ تجارت نئی دولت اور مواقع کا وسیلہ بن سکتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ مقامی آبادیوں میں وسیع اکھاڑ پچھاڑ اور تغیر و تبدل بھی لا سکتی ہے۔ امریکہ سمیت تمام اقوام میں یہ تبدیلی خوف کا باعث بھی بنی ہے۔ اس بات کا خوف کہ جدیدیت ہماری معاشی پسند ناپسند کا اختیار، ہماری سیاست اور سب سے بڑھ کر، ہماری شناخت ہم سے چھین لے گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہم اپنی برادریوں، خاندانوں، روایات اور عقائد میں سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انسانی ترقی کبھی روکی نہیں جاسکتی۔ ترقی اور روایات میں تضاد ہونا لازمی نہیں ہے۔ جاپان اور جنوبی کوریا جیسے ممالک نے اپنی مخصوص ثقافت کو برقرار رکھتے ہوئے زبردست معاشی ترقی کی ہے۔ یہی بات کوالالمپور سے لے کر دوبئی تک مسلمان اکثریت والے ملکوں کی حیرت انگیز ترقی پر بھی صادق آتی ہے۔ قدیم وقتوں میں اور ہمارے زمانے میں بھی مسلمان کمیونٹیوں نے دکھایا ہے کہ وہ تعلیم اور اختراع میں کمال حاصل کرسکتی ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ترقیاتی منصوبہ صرف زمین سے اگنے والی اشیاء پر مرکوز نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے اس صورت میں برقرار رکھا جاسکتا ہے، جب نوجوان طبقہ بیروزگار ہو۔ کئی خلیجی ریاستوں نے تیل کی بدولت خوشحالی حاصل کی ہے اور وہ وسیع تر ترقی پر بھی اپنی توجہ مرکوز کر رہی ہیں۔ لیکن ہم سب کو یہ بات جاننی چاہئے کہ اکیسویں صدی کا سکہ رائج الوقت تعلیم اور اختراع ہوگا۔ ایسی مسلمان آبادیوں کی تعداد خاصی ہے جن میں ان شعبوں میں بہت کم سرمایہ لگایا گیا ہے۔ میں اپنے ملک میں بھی ان شعبوں میں پیسے لگانے پر زور دے رہا ہوں اور اگرچہ ماضی میں امریکہ نے اس خطے میں تیل اور گیس ہی پر توجہ مرکوز کی ہے، اب ہم وسیع تر تعلقات چاہتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہم دوطرفہ اشتراک کے پروگراموں کو وسعت دیں گے اور وظائف میں اضافہ کریں گے۔ ایسے ہی ایک وظیفے کی بدولت میرے والد امریکہ آئے تھے۔ اور ساتھ ہی امریکی طلباء کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ وہ مسلم ممالک میں تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بدلے میں ہم ہونہار مسلم طلباء کو امریکہ میں انٹرن شپ دیں گے، دنیا بھر کے اساتذہ اور بچوں کی آن لائن تعلیم اور تربیت کو فروغ دیں گے اور نئے نیٹ ورک قائم کریں گے تاکہ کنساس میں بیٹھا ہوا ایک بچہ قاہرہ میں بیٹھے بچے سے فوری تبادلہ خیالات کرسکے۔ اقتصادی ترقی کے شعبے میں، ہم بزنس کے رضا کاروں کی ایک جماعت تیار کریں گے جو مسلم اکثریتی ممالک میں موجود رضا کاروں کے ساتھ مل کر کام کرسکیں اور میں اس سال انٹر پرینیور شپ کے ایک سربراہی اجلاس کی میزبانی کروں گا جس میں یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ تجارتی رہنماؤں، اداروں اور دنیا بھر کی مسلم برادریوں کے ساتھ روابط کیسے مضبوط بنائے جائیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں، ہم مسلم اکثریتی ممالک میں ٹیکنالوجیکل ترقی کی امداد کے لئے اور نظریات کے منڈیوں تک منتقلی کے فروغ کے لئے ایک نیا فنڈ قائم کریں گے، تاکہ روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوسکیں۔ ہم افریقہ، مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں نئے سائنسی مراکز قائم کریں گے اور توانائی کے نئے ذرائع، ماحول دوست روزگار، ڈیجیٹل ریکارڈ، صاف پانی اور نئی فصلیں اگانے کے پروگراموں میں تعاون کے لئے سائنسی ایلچی تعینات کریں گے۔ اور آج میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ساتھ مل کر پولیو کے خاتمے کے لئے ایک نئی عالمی کوشش کا اعلان کررہا ہوں۔ اور ہم زچہ و بچہ کی صحت کے فروغ کے لئے بھی مسلم برادریوں کے ساتھ مل کر کام کریں گے، لیکن یہ تمام چیزیں تعاون اور اشتراک کے ساتھ ہی کی جاسکتی ہیں۔ امریکی عوام بہتر زندگی کے حصول کے لئے شہریوں اور حکومتوں، سماجی انجمنوں، مذہبی رہنماؤں اور دنیا بھر کی مسلمان برادریوں میں واقع کاروباری اداروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے تیار ہیں۔ ان تمام معاملات کا حل، جن کا میں نے ذکر کیا، آسان نہیں ہوگا۔ تاہم ہم پر اس دنیا کے حصول کے لئے مل بیٹھنے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ دنیا جہاں انتہا پسند ہمارے عوام کو دہشت زدہ نہ کرسکیں، امریکی فوجی گھر لوٹ جائیں، ایک ایسی دنیا جہاں اسرائیلی اور فلسطینی اپنی اپنی ریاستوں میں محفوظ و مامون ہوں، جہاں ایٹمی توانائی پرامن مقاصد کے لئے استعمال کی جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں حکومتیں اپنے شہریوں کے لئے کام کرتی ہوں اور جہاں خدا کے تمام بندوں کے حقوق کا احترام ہوتا ہو۔ یہ وہ دنیا ہے جس کے ہم متمنی ہیں، لیکن ہم اس کو مل جل کر ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کئی مسلم اور غیرمسلم اس بات پر انگلی اٹھاتے ہیں کہ کیا ہم مل کر ایک نیا آغاز کرسکتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو تفرقے کے شعلوں کو بھڑکانے اور ترقی کے راستے میں کھڑے ہونے کے مشتاق ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ محنت لاحاصل ہے اور ہماری قسمت میں اختلاف لکھا ہوا ہے اور تہذیبوں کا مقدر ہی فنا ہو جاتا ہے اور بہت سے ایسے ہیں جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں کہ آیا واقعی کوئی تبدیلی آسکتی ہے۔ گزشتہ برسوں نے اتنے زیادہ خوف اور اتنی زیادہ بداعتمادی کو جنم دیا ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی سے پیوست رہیں تو کبھی بھی آگے کی طرف نہیں بڑھ سکیں گے اور میں یہ بات خاص طور سے ہر مذہب اور ہر ملک سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم سے زیادہ کسی میں اس دنیا کو نیا تصور دینے اور اسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ہم سب ایک مختصر لمحے کے لئے دنیا میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم اس بات پر توجہ مرکوز کریں گے جو ہمیں ایک دوسرے سے دور دھکیلتی ہے، یا ہم باہم مل کر کوشش کریں گے، مسلسل کوشش، تاکہ مشترکہ میدان تلاش کرسکیں، اس مستقبل پر نظریں جما سکیں جو ہم اپنے بچوں کے لئے اور تمام انسانوں کے وقار کے احترام کے لئے دیکھ رہے ہیں۔ یہ چیزیں آسان نہیں ہیں۔ جنگیں شروع کرنا آسان ہے، ختم کرنا مشکل۔ دوسروں پر الزام دھرنا آسان ہے، اپنے گریبان میں جھانکنا مشکل۔ اختلافات ڈھونڈنا آسان ہے، اتفاق پیدا کرنا مشکل۔ لیکن ہمیں صحیح راستے کا انتخاب کرنا چاہئے، صرف اس راستے کا نہیں جو آسان ہو۔ ایک اصول ایسا بھی ہے جو ہر مذہب کی بنیادوں میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ وہ سلوک نہ کریں جو ہم ان کی طرف سے خود پر روا رکھنا پسند نہ کرتے ہوں۔ یہ حقیقت قوموں اور افراد سے بالاتر ہے، یہ وہ عقیدہ ہے جو نیا نہیں، جو نہ کالا ہے نہ سفید نہ بھورا، یہ نہ عیسائی ہے نہ مسلم نہ یہودی۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو تہذیبوں کے گہوارے میں پروان چڑھا ہے اور جو اب بھی دنیا کے اربوں انسانوں کے دلوں میں دھڑکتا ہے۔ یہ دوسروں پر اعتقاد ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آج مجھے یہاں لے کر آئی ہے۔ ہمارے پاس وہ قوت موجود ہے کہ ہم وہ دنیا حاصل کرسکیں جس کے ہم متلاشی ہیں، لیکن یہ کام صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہمارے پاس نئے آغاز کا حوصلہ موجود ہو، ساتھ ہی ساتھ وہ بھی ذہن میں رکھتے ہوئے جو لکھا ہوا ہے: قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے: ''اے بنی انسان، ہم نے تمہیں مرد اور عورت پیدا کیا اور ہم نے قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو''۔ تالمود ہمیں کہتی ہے: ''تمام تورات امن کے فروغ کے مقصد کے لئے ہے''۔ بائبل مقدس کہتی ہے: ''امن قائم کرنے والوں پر برکت، وہ خدا کے بچے کہلائیں گے''۔ دنیا کے لوگ امن سے اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہی خدا کی منشاء ہے۔ اب ہمیں زمین پر اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ آپ کا شکریہ۔ آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ شکریہ۔ ●●

میں ان لوگوں کا موقف سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ کچھ ممالک کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے اور کچھ کے پاس نہیں۔ کسی واحد ملک کو یہ اختیار نہیں ہونا چاہئے کہ کون سے ممالک کے پاس ایٹمی اسلحہ ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس امریکی اقرار کا اعادہ کرتا ہوں جس کے تحت ایک ایسی دنیا کی جستجو کی جائے گی جہاں کسی ملک کے پاس بھی ایٹمی ہتھیار نہ ہوں اور ہر ملک کو، بشمول ایران، عدم پھیلاؤ کے معاہدے کے تحت پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے حصول کا حق ہو۔ یہ اقرار اس معاہدے کی بنیاد ہے اور سب کو اس پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ علاقے کے تمام ملک اس مقصد میں شریک ہوسکتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام اور بیسویں صدی کے معاشی بحران

کاشف حسن خان

آج سرمایہ دارانہ نظام اپنے موجودہ بحران کی وجہ سے اپنی ناکامی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (International Monetary Fund) کے مطابق امریکہ پچھلے تیس برسوں میں سو سے زیادہ معاشی بحران جھیل چکا ہے۔ جس میں سے سب سے بڑا ۱۹۲۹ء میں ہوا جب امریکہ کا اسٹاک ایکسچینج پوری طرح تباہ و برباد ہوگیا۔ جس کا نتیجہ عالمی کساد بازاری کی شکل میں سامنے آیا، پھر ۱۹۸۷ء میں وال اسٹریٹ کریش (Wall Street Crash) جب ''ڈوجانس Dow Jones Index 22.6% سے نیچے گرا اس کا اثر عالمی مالیاتی بازار پر پڑا۔ اس بحران کی بحالی میں پورے دو سال لگ گئے۔ پھر آٹھ سال کے بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ جو ہانگ کانگ سے شروع ہوا اور پھیلتے پھیلتے جاپان، یورپ اور امریکہ تک پہنچا۔ اس بحران نے ایک ہی دن میں تین Trillion ڈالرس کا نقصان پہنچایا جس کا نام Asian Tigers پڑا۔

یہ بحران کیوں آئے؟

لانگ ٹرم کیپٹل مینجمنٹ ۱۹۹۸ء مشرقی ایشیا کا مالی بحران (LTCM) امریکہ ایک Hedgefund ہے جس کا بنیادی مقصد اسٹاک پراپرٹی Commodities اور غیرملکی زرمبادلہ کے بازاروں میں سٹہ کا کاروبار کرنا ہے۔ اس طرح کے Hedge Fund کا اپنا ذاتی سرمایہ کم اور قرضوں پر اعتماد زیادہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا Liverage بھی زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اسٹاک ایکسچینج میں جو بحران آئے ہیں ان سب میں Hedge Fund کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ LTCM کا اپنا ذاتی سرمایہ بحران سے پہلے چار بلین ڈالرز تھا لیکن اس کا Liverage پچیس تھا، یعنی ذاتی سرمایہ ایک ڈالر کے مقابلے پچیس ڈالر قرض لیا ہوا تھا۔ جب اس کے اساسوں کی قیمت کم ہونے لگی تو اس نے مزید قرض لے لیا جس سے Liverage پچاس ہوگیا۔ یہاں تک کہ Liverage ۱۴۷ تک پہنچ گیا۔ اگر امریکہ اس کی مدد کے لئے نہ آتا تو بحران پوری دنیا کے بینکاری نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں جو سب سے بڑی پریشانی سامنے آتی ہے وہ ہے ''سود'' کے بنا پر قرض کا بہاؤ! جس کی وجہ سے بینک نجی شعبوں کو دل کھول کر قرض دیتے ہیں اور یہ صورت سٹے کا باعث بنتی ہے۔ ان قرضوں کی وجہ سے اسٹاک اور پراپرٹی بازاروں میں سٹے کے کاروبار میں سرگرمی کا سبب بنتی ہے۔ جیسا کہ ۱۹۹۷ء میں بھی ہوا۔ اس سرگرمی کی وجہ سے قیمتیں اوپر جاتی ہیں۔ جب حالات تبدیل ہوتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے ہوسکتے ہیں تو غیرملکی بینک اپنا قرض واپس مانگنا شروع کردیتے ہیں تو ملکی بینک بھی اپنا قرض مانگنا شروع کردیتے ہیں۔ پھر قرضدار اپنے اثاثوں کو بیچنا شروع کرتے ہیں جس سے قیمتیں تیزی سے گرنے لگتی ہیں اور قرضداروں کے لئے قرض کا ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ۱۹۹۷ء میں بھی ہوا۔

اسٹاک مارکیٹ کریش ۱۹۸۷ء:

۱۹؍اکتوبر ۱۹۸۷ء تاریخ میں ایک ایسا بحران ہے جس نے ایک دن میں امریکہ کے Dow Jones Index کو ۲۲.۶ فیصد

باقی صفحہ ۸ پر

اہم خبروں کا اختصار

ملکی

● سری نگر- جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے سربراہ یٰسین ملک نے کہا ہے کہ جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوتا برصغیر میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

● نئی دہلی- بی جے پی کے لیڈر کریا منڈا اتفاق رائے سے لوک سبھا کے ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوگئے۔ان کے نام کی تجویز ۱۲ ممبران لوک سبھا نے پیش کی تھی۔مقابلہ میں کوئی اور نہیں تھا۔

● بھوپال- ممتاز ڈرامہ نگار پدم بھوشن حبیب تنویر کا یہاں ایک اسپتال میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔وہ ۸۶ برس کے تھے، پسماندگی میں صرف ایک بیٹی نگینہ ہے۔

● نئی دہلی- اقلیتی امور کے وزیر مملکت سلمان خورشید نے کہا ہے کہ اگر پسماندہ مسلمانوں کے لئے ۷ء۲ فیصد ریزرویشن ناکافی پایا جاتا ہے تو سرکار دیگر حل پر غور وفکر کرے گی۔

● نئی دہلی- سپریم کورٹ نے اترپردیش میں آئی اے ایس افسروں کے مبینہ طور پر من مانے ڈھنگ سے تبادلہ کو چیلنج کرنے والی مفاد عامہ کی ایک عرضی پر مایاوتی حکومت کو نوٹس جاری کیا ہے۔

● نئی دہلی- بھارتیہ جن شکتی پارٹی کی لیڈر راوما بھارتی نے کہا ہے کہ کانگریس کے لیڈر راہل گاندھی ۲۴ کریٹ دیسی ہیں اور یہ سچ کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا کہ مسز سونیا گاندھی غیر ملکی نسل کی ہیں۔

● نئی دہلی- سماج وادی پارٹی کے صدر ملائم سنگھ یادو نے موجودہ خواتین بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بل پاس ہوگیا تو زیادہ تر مرد ممبران پارلیمنٹ پھر لوک سبھا کا منہ تک نہیں دیکھ پائیں گے اور آج جو اس کی حمایت میں میز تھپتھپا رہے ہیں وہ گھر بیٹھ کر چارپائی تھپتھپائیں گے۔

● نئی دہلی- دہلی میں سوائن فلو کے ایک اور معاملے کی تصدیق کے ساتھ ہی ملک میں اس کے گیارہ معاملے ہوگئے جن میں سات حیدرآباد کے اور دو دو کوئمبٹور اور دہلی کے ہیں۔

● ممبئی- مہاراشٹر کے وزیر تعلیم رادھا کرشن وکھے پاٹل نے ریاستی اسمبلی میں کہا کہ ریاست کے اقلیتی اداروں کو ۵۰ فیصد اقلیتی طلباء کو داخلہ دینے کی اجازت ہوگی اور بقیہ ۵۰ فیصد نشستیں عام طلباء کو میرٹ کی بنیاد پر دی جائیں گی۔

● ممبئی- این سی پی کے ممبر پارلیمنٹ اور سابق ریاستی وزیر داخلہ پدم سنگھ پاٹل کو سی بی آئی نے ۲۰۰۶ء میں اپنے چچازاد بھائی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔

● پونے- اسپیشل آپریشن ونگ نے دہشت گردوں کی مدد کے الزام میں دو ہندتو وادی سریش سوریہ ونشی اور لکشمن کالورام بھونسلے کو گرفتار کرلیا ہے۔

● نئی دہلی- جنتادل متحدہ کے لیڈر اور حاجی پور (محفوظ) میں رام ولاس پاسوان کو شکست دینے والے رام سندر داس نے کہا کہ ان کی پارٹی بہار کو خصوصی ریاست کا درجہ ملنے تک جدوجہد جاری رکھے گی۔

● نئی دہلی- سپریم کورٹ نے آسام میں ایک مجرم کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کی قومی انسانی حقوق کمیشن کی سفارش پر سخت سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن کا قیام انسانی حقوق کی پامالی کی جانچ کے لئے کیا گیا ہے نہ کہ عدالتوں کے ذریعہ دیئے گئے حکم پر فیصلہ کرنے کے لئے۔

● ممبئی- یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے صدر مولانا بدرالدین اجمل نے یہاں جم خانہ میں اپنے اعزاز میں منعقدہ عشائیہ میں کہا کہ ان کا فرنٹ مہاراشٹر کے اسمبلی انتخابات میں حصہ لے گا اور زیادہ سے زیادہ نشستوں پر مقابلہ کرے گا تاکہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑھائی جائے۔

● نئی دہلی- بھارتیہ جن شکتی پارٹی کی لیڈر اوما بھارتی نے کہا ہے کہ بی جے پی کے اندرونی امور سے انہیں کوئی لینا دینا نہیں ہے لیکن اگر وہ موجودہ خواتین ریزرویشن بل میں دلت، قبائلی اور پسماندہ طبقات کی خواہش کو ریزرویشن دینے کی دفعہ شامل ہونے پر بل کی حمایت کرتی ہے تو وہ اپنی پارٹی کو این ڈی اے میں شامل کرنے کو تیار ہیں۔

● شیلانگ- ہندوستان اور بنگلہ دیش نے سرحد کے آرپار علاحدگی پسندوں کی آمد ورفت اور ہتھیاروں کی اسمگلنگ روکنے کے لئے بارڈر سیکوریٹی فورس کو مضبوط کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بین الاقوامی

● ریاض- سعودی عرب کے حکمراں شاہ عبداللہ نے امریکی صدر بارک اوباما سے کہا ہے کہ ہم آپ سے مسئلہ فلسطین کے حل میں مکمل تعاون چاہتے ہیں۔آپ اس مسئلہ کا حل نکال کراسے سختی سے نافذ کرائیں۔

● قاہرہ- امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے اے بی سی ٹیلی ویژن کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہا کہ اسرائیل کو قیام امن کے لئے مغربی کنارے میں آبادکاری روکنی ہوگی اور فلسطینی ریاست کے قیام کی حمایت کرنی ہوگی۔

● بیروت- لبنان کے انتخابات میں حکمراں سعد حریری کی قیادت والے مخلوط اتحاد نے ۱۲۸ میں سے ۷۱ نشستیں حاصل کرلیں اور حزب اللہ کی قیادت والے اتحاد کو ۵۷ نشستیں ملیں اور اس نے شکست کا اعتراف بھی کرلیا۔

● بنکاک- تھائی لینڈ کے مسلم اکثریتی جنوبی علاقے میں بم دھماکے اور فائرنگ کے نتیجے میں تین افراد ہلاک اور ۱۹ سے زائد زخمی ہوگئے۔

● تہران- ایران کے صدارتی امیدوار میرحسن موسوی کی اہلیہ نے اپنے خلاف ریمارکس پر صدر محمود احمدی نژاد کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی ہے۔ اطلاع کے مطابق ۳رجون کے مباحثے کے دوران ایرانی صدر نے ان کی تعلیمی قابلیت پر کئی سوالات اٹھائے تھے۔

● جنین- فلسطینی سیکورٹی حکام نے اسرائیل کے لئے جاسوسی کے الزام میں ایک فلسطینی خاتون کو گرفتار کیا ہے۔ جرم ثابت ہونے پر اسے سزائے موت ہوسکتی ہے۔ادھر غزہ پٹی میں اسرائیلی کارروائی پر چار فلسطینی مزاحمت کار جاں بحق ہوگئے۔

● پیرس -امریکی صدر بارک حسین اوباما نے فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کے ساتھ مشترکہ پریس کانفرنس میں کہا کہ ایٹم بم کی تیاری نہ صرف خود ایران کے لئے انتہائی خطرناک ہوگی بلکہ مشرق وسطی کے دیگر ممالک بھی اس دوڑ میں شریک ہوجائیں گی۔ انہوں نے یورپی یونین میں ترکی کی شمولیت کی مخالفت ترک کرنے اور اسکولوں میں طالبات کے نقاب پہننے پر پابندی ختم کرنے کی اپیل کی۔

● پیرس-فرانس کے صدر نکولس سرکوزی نے کہا کہ اسرائیل اور فلسطین کو سمجھنا چاہئے کہ مسئلہ کا حل دونوں کے مفاد میں ہے۔ اسرائیل فلسطینی علاقوں میں یہودی بستیوں کی توسیع نہ کرے۔

● کابل- افغان انتظامیہ نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے پاس اتنی فوج نہیں جو ملک کے تمام حصوں کی نگرانی کرسکے، ملک کے کم از کم دس اضلاع ایسے ہیں جہاں طالبان کا کنٹرول ہے جس کے باعث وہاں صدارتی اور عام انتخابات کے لئے شیڈول کے مطابق پولنگ ناممکن ہے۔

● سیول- شمالی کوریا نے امریکہ کی دو خاتون صحافیوں ایونالی اور کارا لنگ کو ملک میں غیر قانونی طریقے سے داخل ہونے کے الزام میں ۱۲ سال قید بامشقت کی سزا سنائی ہے۔ شمالی کوریا کے اس قدم پر امریکہ نے سخت تشویش ظاہر کی ہے۔

● کابل- افغانستان میں بم دھماکے اور تشدد کے دیگر واقعات میں ۲۷ طالبان ہلاک جب کہ دو جرمن فوجی زخمی ہوگئے۔

● واشنگٹن- امریکی صدر بارک حسین اوباما کے معاون بروس رائڈل نے کہا ہے کہ امریکہ کا کشمیر کے معاملے میں مداخلت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن وہ کشیدگی کم کرنے کی ہندوستان اور پاکستان کی ہرکوشش کی حمایت کرے گا۔

● سیول- جنوبی کوریا نے شمالی کوریا کے کسی بھی میزائل حملہ کا توڑ کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے جس میں میزائل ٹھکانہ پر فضائی حملہ بھی شامل ہے۔ یہ اطلاع سیول کے روزنامہ یون ہیپ نے فوجی ذرائع کے حوالے سے دی۔

● موغادیشو-صومالیہ میں متحارب گروپوں کی لڑائی میں ۱۲۳ افراد ہلاک ہوگئے۔

● تل ابیب- بیت المقدس میں اسرائیلی پولیس اور انتہاپسند یہودیوں کے درمیان تصادم میں چھ پولیس اہلکار زخمی ہوگئے۔ جب کہ پانچ مظاہرین کو گرفتار کرلیا گیا۔

بقیہ: سول سروسز کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینی کی ضرورت ہے

مولانا فضل الرحیم مجددی ندوی نے اس سے بڑا کارنامہ اس وقت انجام دیا جب ان کی کوششوں اوران کی کوچنگ سے گزشتہ دو سال میں سترہ (۱۷) مسلم طلباء کا شمالی ہند کی مختلف عدالتوں میں ڈسٹرک کورٹ میں بطور جج انتخاب ہوا، اس کے علاوہ گجرات فسادات میں وہاں کے مسلمانوں کی قانونی مدد اور مجرم سرکاری افسران ووزراء کے خلاف عدالتی کارروائی میں بھی انہوں نے خاموشی سے اہم رول ادا کیا، اس سے مجھے اطمینان ہوا کہ اس الزام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کہ ہمارے علماء نے زمانہ کے تقاضوں پر توجہ نہیں دی اور عصری تعلیم کے میدان میں امت کی رہنمائی نہیں کی، جامعہ ملیہ کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ تھے،مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ایک انٹگرل یونیورسٹی کے بانی وچانسلر ہیں،مولانا غلام وستانوی انجینئرنگ کالج چلارہے ہیں، مولانا ریاض الرحمٰن رشادی بنگلوری کے ٹیکنیکل کالج کی پورے ملک میں شہرت ہے، مولانا سید سلمان حسینی ندوی ایک میڈیکل کالج چلارہے ہیں،مولانا اسرارالحق قاسمی کے بہار وبنگال میں عصری اسکول پورے ملک کے لئے نمونہ ہیں۔

یہ تو چند مثالیں ہیں جن کے اداروں کو بذات خود میں نے دیکھا ہے اوران کے ذمہ داروں سے ذاتی طور پر میں واقف ہوں ورنہ پورے ملک میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، مذکورہ بالا باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ ہمارے علماء اگر عصر حاضر میں اپنے اسلاف اور بزرگوں کے حوالہ سے اپنی افادیت اور خدمات کو ثابت کرنے اوراپنی حیثیت منوانے کے بجائے خود اپنے کارناموں اور صلاحیتوں سے ملکی وملی خدمات کے میدان میں اپنا وجود ثابت کرنے کی کوشش کریں تو دین ودنیا کی اس خود ساختہ تقسیم کے مفروضہ کو ختم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اگر چہ مجھے اس سے اتفاق نہیں جس طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ علماء کو بھی سول سروس کے امتحان میں آنا چاہئے، گزشتہ سال دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا، چند سال قبل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک فاضل نے بھی آئی اے ایس میں کامیابی حاصل کی اگر بالفرض ملک میں ایک سو علماء نے بھی آئندہ چند برسوں میں سول سروس میں کامیابی حاصل کی تو کیا اس ملک میں مسلمانوں کی قسمت بدل جائے گی، ہرگز نہیں! ہمارے مدارس کے قیام کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے! ہمارے دینی مدارس کا قیام دین کے متخصصین اور شریعت کے ماہرین پیدا کرنے کے لئے ہوا تھا، اس کو اسی کے لئے خاص رکھا جانا چاہئے، اگر دینی مدارس سے بھی سرکاری افسران اور جدید تعلیم یافتہ لوگ نکلنے لگیں گے تو پھر علماء، فضلاء، اہل اللہ واولیاء، فقہاء اور مفسرین ومحدثین کیا اسکولوں اور کالجس سے نکلیں گے، یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ان مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم ونظام میں دینی روح کو باقی رکھتے ہوئے عالمی سطح کے حالات اور دعوتی تقاضوں کے پیش نظر ایسی تبدیلی ہونی چاہئے جس سے ہمارے فارغین اور فضلاء اور بہتر طریقے پر اپنے دعوتی فریضہ کو انجام دے سکیں اور ملت وشریعت کی بقاء اور استحکام کے لئے ان کی کوششوں کا اثر مزید دیرپا اور مستحکم ہو لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مدارس کو اپنے مقاصد سے ہٹا کر کالجس اور یونیورسٹیوں میں تبدیل کیا جائے، مدارس کو موڈرنائز کرنے سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے مسلم اسکولوں اور کالجس کو دین کی بنیادوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی جائے اور وہاں زیر تعلیم طلباء کو اسلام پر باقی رکھنے کی فکر کی جائے جو غیر شعوری طور پر تیزی سے فکری ارتداد میں مبتلا ہورہے ہیں لیکن افسوس اس کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے جب کہ یہاں ۹۸ فیصد طلباء زیر تعلیم ہیں اور پوری دنیا والوں کو ان مدارس کی فکر ہے جہاں دو فیصد طلباء بھی نہیں پڑھتے۔

ہمارے ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں صرف مسلم آئی اے ایس افسران کی تعداد کا بڑھنا بھی کافی نہیں ہے بلکہ ایسے مسلم طلباء کو اس میں بھیجنے کی کوشش کرنی چاہئے جو بنیادی دینی تعلیم کے اعتبار سے پختہ ہوں اور اپنے مذہب وشریعت اور دین پر ان کا عقیدہ مضبوط ہو اوران کو اسلام اور ایمان کے متعلق خود اعتمادی حاصل ہو، وہ ان مسلم افسران کی طرح نہ ہوں جو اپنے کو حد سے زیادہ سیکولر ثابت کرنے اور حکومت کی نظر میں محبوب بننے کے چکر میں مسلمانوں کو ان کا جائز حق دلانے میں بھی پس وپیش سے کام لیتے ہیں، اسی طرح ہمارے ملک میں مسلمانوں کے موجودہ سیاسی، سماجی وتعلیمی مسائل کا حل بھی اس میں نہیں ہے کہ اسمبلی اور پارلیمان میں مسلم نمائندگی میں اضافہ ہو،ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ منتخب ممبران صرف پانچ سال تک حکومت میں رہتے ہیں اوران کو اپنی ملت وقوم سے زیادہ اپنی پارٹی کا مفاد عزیز ہوتا ہے جن کے واسطے سے ان کو حکومت میں شامل ہونے کا موقع ملتا ہے،اس کے برخلاف ملک کے نظم ونسق اور پالیسی بنانے اوراس کو نافذ کرنے میں سب سے اہم اور بنیادی کردار سول سروس میں اعلیٰ مناصب پر فائز ان ہی سرکاری افسران کا ہوتا ہے، یہ اپنے تقرر کے بعد سے کم وبیش چالیس سال تک مسلسل اپنی صلاحیتوں اور ذہانتوں سے ملک کی تقدیر کا دھارا بدل دیتے ہیں،مثلاً موجودہ الیکشن میں پارلیمانی حلقوں کی تقسیم میں اکثر مسلم حلقوں کو پسماندہ ونچلی ذات کے لئے محفوظ قرار دے کر وہاں سے مسلم ممبران آنے کے امکانات ہی کو ختم کردیا گیا۔ اسی طرح پارلیمانی حلقوں کی ازسرنو حد بندی میں مسلم اکثریتی علاقوں کو اس طرح کاٹ دیا گیا کہ مسلم ووٹ بکھر جائے اور مسلمانوں کو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر کسی کو ہرانے یا جتانے کا زعم نہ ہو۔ اس طرح کا منصوبہ بند کام ممبران پارلیمان یا اسمبلی نے نہیں کیا بلکہ سول سروس میں شامل الیکشن کمیشن کے ان افسران نے کیا تھا جن کی ذہن سازی آرایس ایس نے سالوں پہلے کی تھی اور جن کو بی جے پی حکومت کے زمانہ میں ان مناصب پر فائز کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ہماری ملت کا ایک آئی اے ایس قابل مسلم افسر حقیقت میں دس ممبران اسمبلی اور پارلیمان پر بھاری ہے اور ہمیں مسلم ممبران پارلیمان واسمبلی میں اضافہ کی کوشش کے بجائے سول سروس میں مسلمانوں کی تعداد کو بڑھانے کی فکر کرنی چاہئے۔ ●●

بقیہ: مغرب، اسلام کی مقبولیت سے خوفزدہ

پر اسلامی ریاست کا قیام ہورہا ہے، اس کو مستحکم ہونے سے پہلے ختم کردیا جائے، اسی مقصد سے جنگوں کا سلسلہ شروع کیا گیا، انگریز مصنف لارڈ ایڈلے نے مذکورہ جنگوں کا تجزیہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ ان میں جارح کون اور جارحیت کا مقابلہ کون کر رہا تھا، جنگوں کے جائے وقوع سے بہ آسانی اندازہ ہوجاتا ہے، پہلی ''جنگ بدر'' اس میدان میں لڑی گئی جو مدینہ سے تیس میل کے فاصلے پر ہے، مدینہ سے طویل مسافت طے کرکے کفار مکہ وہاں پہنچے تھے، دوسری جنگ احد میں ہوئی جو مدینہ سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے، اس جنگ میں بھی حملہ آور اہل مکہ تھے، تیسری جنگ ''غزوہ احزاب'' ہے، جس میں عرب کے تمام دشمنان اسلام بشمول یہود نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا، ان تینوں جنگوں سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ حملہ آور مسلمان نہیں، ان کے حریف تھے اور دفاع کی ذمے داری مسلمان نبھا رہے تھے، یہ بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں نے طاقت حاصل کرنے کے بعد پہلی مرتبہ جنگ کے لئے نہیں حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جانے کا قصد کیا تو اس امر کے باوجود کہ وہ اپنی قوت کے بل پر بآسانی وہاں پہنچ سکتے تھے، اہل مکہ نے انہیں فوراً داخلہ کی اجازت نہیں دی بلکہ ایک سال بعد کی شرط عائد کردی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض امن کو قائم رکھنے کے لئے ان کی جملہ شرائط کو قبول کرلیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امن پسندی کا اس سے بڑا شاہکار وہ مرحلہ ہے جب آپ ﷺ مسلمانوں کے لشکر عظیم کے ہمراہ فاتح کی حیثیت سے اپنے قدیم وطن مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو جنھوں نے آپ کو اس شہر سے نکالا تھا انہیں پناہ دے دی، جنگ وخونریزی تو درکنار کسی دشمن اسلام کو ایک خراش تک نہیں لگی، ان کی جانیں اور املاک محفوظ رہیں، اس سے بڑھ کر اسلام کی امن پسندی اور پیغمبر اسلام کی انسانیت نوازی کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے؟

موجودہ عالم اسلام کے نقشے پر بھی اگر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کئی علاقے ایسے ہیں جہاں کبھی مسلمانوں نے لشکر کشی نہیں کی، انڈونیشیا، ملائشیا، مالدیپ اور افریقہ کے بہت سے ممالک میں عرب تاجر اور علمائے کرام کے ذریعے اسلام کی روشنی پہنچی، ہندوستان سمیت بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں سب سے پہلے صوفیائے کرام خیمہ زن ہوئے اور اخلاق کی تلوار سے لوگوں کے دل مسخر کرلئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور مولانا سید کرامت علی جونپوری کے ہاتھوں لاکھوں اشخاص مشرف بہ اسلام ہوئے، یہ دلوں کو فتح کرنے اور محبت کی تلوار سے دشمنوں کو گرویدہ بنانے کا فن جانتے تھے۔ آج امریکہ ویورپ میں اسلام قبول کرنے کی جو لہر چل رہی ہے اس کی وجہ کونسی طاقت یا جبر ہے، اسلام کی سادگی اور فکری قوت کا ہی یہ کرشمہ ہے کہ وہاں اس مذہب کے تئیں لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ افسوس کہ تعصب وتنگ نظری کے شکار مغرب کے دانشور مذکورہ حقائق کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ ●●

پروفیسر جبین نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ کوآرڈینیٹر نامزد

سہسرام- نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ نئی دہلی بھارت سرکار کے سکریٹری کھان سنگھ کے مراسلہ نمبر ۳۵۵۵۷، ۱۳رمئی ۲۰۰۹ء کے بموجب کل ہند کانگریس کمیٹی کی رکن وصدر شعبہ اُردو فارسی وڈین آف ہیومنیٹیز ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ پروفیسر ڈاکٹر ایس کے جبین کو ان کی بہتر کارکردگی کے پیش نظر چیئرمین نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ بھارت سرکار نئی دہلی نے تیسری مرتبہ کوآرڈینیٹر نامزد کیا ہے۔ان کا حلقۂ عمل بہار کا رہتاس ضلع ہے۔

تعزیتی نشست کا انعقاد

نئی دہلی- محترمہ کملا ثریا کے انتقال پر اسلامک فاؤنڈیشن آف انڈیا کی طرف سے ۳رجون کو منعقدہ ایک تعزیتی میٹنگ میں مولانا احمد علی قاسمی نائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے کہا کہ کملا ثریا نے ۱۲ردسمبر ۱۹۹۹ء رمضان کے مبارک مہینے میں کیرلا کے شہر کوچین میں ایک علمی وادبی تقریب میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام اختیار کرنے کے بعد بے پناہ جرأت مندی اور ایمانی قوت سے سرفراز کیا تھا۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا تھا کہ میں نے کسی دباؤ کے تحت اسلام قبول نہیں کیا ہے یہ میرا آزادنہ فیصلہ ہے اور میں اسلام قبول کرنے پر کسی کی تنقید کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ اس میٹنگ میں صدر فاؤنڈیشن سالک دھامپوری، سید عثمان علی بدایونی، حکیم سید احمد خاں، محمد عثمان خاں، جاوید اختر، مولانا عبدالسلام قاسمی اور دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔

عبداللہ بخاری ایمس منتقل

نئی دہلی- شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاری کو یہاں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کرایا گیا۔ موجودہ شاہی امام مولانا احمد بخاری نے بتایا کہ ان کے والد کو جو ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کرایا گیا ہے۔ مولانا سید عبداللہ بخاری کافی عرصہ سے صاحب فراش ہیں۔

اجمل قصاب کا مطالبہ

ممبئی- ممبئی دہشت گردانہ حملوں کے کلیدی ملزم اجمل قصاب نے جیل میں پنج وقتہ نماز کی ادائیگی کے لئے ٹائم ٹیبل مہیا کئے جانے کا مطالبہ کیا جس پر خصوصی جج ایم ایل تھلیانی نے وکیل دفاع عباس کاظمی کو اسے ٹائم ٹیبل مہیا کرائے جانے کا حکم دیا۔ جج تھلیانی کے روبرو آج قصاب اس معاملے کے ایک دوسرے ملزم فہیم انصاری سے نماز کے اوقات کے تعلق سے پوچھ تاچھ کررہا تھا جس پر جج تھلیانی نے اس سے دریافت کیا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے جس پر قصاب نے کہا کہ وہ جیل میں پنج وقتہ نماز اس کے مقررہ کردہ اوقات پر ادا کرنا چاہتا ہے۔

دعائے مغفرت

ارریہ (بہار)- قدیم رکن جماعت جناب مصلح الدین صاحب کا پچھلے دنوں آبائی گاؤں روپیلی (رجوکھر) میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم لمبے عرصے سے مختلف امراض کے شکار تھے۔ عابد فاروقی، ناظم ضلع ارریا مرحوم کیلئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے

پوتوں کی ختنہ کرانے پر دادا گرفتار

جے پور- اجمیر ضلع کے بیاور علاقے میں ایک دادا مانگی لال کاٹھات (جو مسلمان ہیں) نے اپنے دو پوتوں کی ختنہ کروادی، اس پر ان کے بیٹے نے ان پر اپنے بچوں کی تبدیلی مذہب کا الزام لگاتے ہوئے ان کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کروادی۔ پولیس نے مانگی لال کاٹھات (تمغۂ بہادری سے نوازے ہوئے) ان کی اہلیہ سکینہ اور ختنہ کنندہ مولوی گھیسو خاں کو دفعہ ۳۰۷ (قتل کی کوشش)، ۳۲۰۔ (مہلک چوٹ پہنچانے کی کوشش) اور ۲۹۵ اے (مذہبی جذبات کو چوٹ پہنچانا) کے تحت گرفتار کرلیا۔

اجمیر کے بیاور علاقے میں بسنے والی کاٹھات برادری کی تاریخ دلچسپ ہے۔ دسویں صدی میں چوہان قبیلے کے حکمراں لکھن سنگھ کے دو بیٹوں انوپ اور انہل نے گرجر حکمرانوں کو علاقے سے بے دخل کرکے قبضہ کرلیا اور ''چانگ'' کو دارالحکومت بنایا۔ انہل کی ۲۴ ویں پیڑھی میں ہرراج وبلراج پیدا ہوئے جنہوں نے ۱۳۹۳ء میں اسلام قبول کرلیا۔ بہادری کے باعث ہرراج کو علاء الدین خلجی نے اعزازاً ''کاٹھا'' (یعنی سخت جان) کا لقب دیا۔ ان کی اولاد چیتا، مہرات اور کاٹھات (عموماً کاٹھات) کہلائی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد بلراج کے جاں نشین (جو بُرڑیا رَاوت کہلاتے ہیں) مرتد ہوگئے لیکن ہرراج یعنی کاٹھا کے جاں نشین آج تک اسلام پر قائم ہیں۔ اس برادری میں تمام تر جہالت کے باوجود اسلام کی تین نشانیاں ہمیشہ موجود رہیں، اپنے مردوں کو دفن کرنا، حلال گوشت کھانا اور ختنہ کرانا۔ مانگی لال کاٹھات شروع میں کچھ عرصہ تک وشو ہندو پریشد کے ساتھ مل کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کرتے رہے۔ بعد میں شعور آنے پر تائب ہوئے اور علانیہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا جسے انہوں نے اپنے قبیلے کے رواج کے مطابق دفن کیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے دوسرا نکاح کرلیا۔ دوسری بیوی سکینہ کے ساتھ ان کے پہلے شوہر کا معذور بیٹا قمرالدین بھی آیا۔ اس پر ان کے پہلے بیٹے راجیش کے سسرالی رشتہ داروں اور بعض فرقہ پرست تنظیموں سے وابستہ لوگوں نے اُکسایا کہ اب اسے والد کی جائیداد میں سے حصہ نہیں ملے گا اور اس کی سوتیلی ماں اور اس کا بیٹا جائیداد پر قابض ہوجائیں گے۔ اسی دوران وہ موقع آگیا جب سال میں ایک بار برادری کے بچوں کی اجتماعی ختنہ کرائی جاتی ہے۔ مانگی لال نے اپنے بیٹے راجیش اور اس کی بیوی جمنہ سے کہا کہ میں اپنے پوتوں راہل اور اشوک کی بھی ختنہ کرانا چاہتا ہوں۔ ان دونوں نے رضا مندی ظاہر کردی کیونکہ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی، برادری کا رواج تھا جو سب کو لازماً اپنانا ہی تھا۔

۲۴رمئی ۲۰۰۹ء کو قریب کے ایک گاؤں شوگری میں دیگر ۳۸ بچوں کے ہمراہ مانگی لال کے پوتوں کی بھی ختنہ ہوگئی۔ گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔ لیکن ۲۶ مئی کو اچانک راجیش نے اپنے والد کے خلاف اپنے بچوں کی جبراً ختنہ کروانے اوران کا مذہب تبدیل کرنے کا الزام لگاتے ہوئے رپورٹ کرادی۔ بیاور کوتوالی پولیس نے مانگی لال، سکینہ اور ختنہ کرنے والے مولوی گھیسو خاں کو گرفتار کرلیا۔ برادری کے ذمہ داران نے جے پور میں پریس کانفرنس کرکے میڈیا کو بتایا کہ مانگی لال نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، وہ مسلمان ہیں اور ایک مسلمان اگر اپنے بچوں کی ختنہ کراتا ہے تو اس میں تبدیلی مذہب کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، فی الحال مانگی لال کاٹھات عدالتی حراست میں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ مانگی لال کو انصاف ملتا ہے یا تعصب ہی کا بول بالا ہوتا ہے

ڈاکٹر محمد اقبال صدیقی

بقیہ: کامیاب عورت کا مغربی اور اسلامی نقطہ نظر

معاشرے میں عورت مرد سے کمتر ہے، بلکہ اس کی ممانعت کے خاص دلائل موجود ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا'' جولوگ ایک عورت کو حکمرانی کے عہدے پر فائز کرتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتے'' مزید یہ کہ اسلام میں حکومت کرنا کوئی عزت یا اعلیٰ مرتبہ کی چیز نہیں سمجھا جاتا کہ یہ ذمہ داری، لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اور ایسا کام جس کا محاسبہ ہوتا ہے، کا معاملہ ہے۔

(۲) کوئی بھی ایسا کام جس میں عورت کی نسوانیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے: عورت ایسا کوئی پیشہ اختیار نہیں کرسکتی جس میں کام کی نوعیت اس کی نسوانیت پر مرکوز ہو جیسا کہ ماڈلنگ اور تشہیر کا کام وغیرہ۔ اسی طرح وہ ایسا کام بھی نہیں کرسکتی جس میں اسے نامحرموں کی موجودگی میں (ہاتھ اور چہرے کے علاوہ) اپنا ستر کھولنا پڑے یا اس کام میں اپنے نامحرموں کو اپنی خوبصورتی کی طرف مائل کرنا پڑے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت سے نوازا ہے اور اس پر فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے تاکہ اس کی نسوانیت کو ایک معاشی چیز سمجھا جائے۔

چنانچہ مسلمان عورت کو یہ تسلی ہونی چاہئے کہ وہ ان کے علاوہ کوئی بھی پیشہ اختیار کرسکتی ہے جو اسلامی احکامات پر پورا اترتا ہو اور جو اسلامی معاشرتی حدود کے اندر ہو اور یہ بات بھی یقینی ہو کہ اس کام میں کسی نامحرم مرد کے ساتھ خلوت یعنی اکیلے مرد کے ساتھ تنہائی تو شامل نہیں تاکہ کوئی بھی اس کے کردار پر انگلی نہ اٹھا سکے اور نہ ہی کسی قسم کے شک کا سبب بن سکے۔ نیز یہ پیشہ مردوں کے ساتھ اختلاط کا باعث نہ ہو اور جتنا ممکن ہوسکے اس میں مردوں کے ساتھ قریبی تعلقات کی ضرورت درکار نہ ہو۔

چنانچہ ان پابندیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عورت ڈاکٹر بن سکتی ہے، انجینئر بن سکتی ہے، کاروبار کرسکتی ہے یا سائنسداں بن سکتی ہے یا پھر استاد بن سکتی ہے اور یوں وہ اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لئے بہت اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

حضورؐ کے دور میں بہت سی مسلمان عورتیں کام کیا کرتی تھیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت سودہؓ جانوروں کی کھالوں کو رنگنے کا کام کرتی تھیں۔ ایک صحابیہ حضرت کلاؓ تجارت کیا کرتی تھیں، بہت سی ایسی روایات موجود ہیں کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضورؐ سے اپنے تجارتی معاملات سے متعلق سوال کیا کرتی تھیں تاکہ ان معاملات میں اسلام کا حکم معلوم ہوسکے۔ جابر بن عبداللہؓ کی چچی کاشت کاری کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح بہت سی خواتین جنگ کے دوران زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں ایک عورت کو قاضی حسبہ بنایا تھا۔

آخری بات:

''کامیاب عورت'' کے مغربی تصور کے مطابق عورت کی حیثیت ایک معاشی چیز سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اسی وقت اس معاشرے کے لئے اہم ہے جب وہ کچھ کما کر انہیں دے رہی ہے۔ استعمار چاہتا کہ مسلمان عورتیں بھی اسی معیار کو اپنائیں اور اسلامی ممالک میں اس تصور کو پروان چڑھایا جائے۔ وہ تصور جو ان کے اپنے معاشرے میں بدبختی اور مسائل کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کرسکا اور جس نے عورت کو اس کی عزت کی حفاظت کرنے کی بجائے اسے ایک کاروباری اشتہار بنا کر رکھ دیا ہے۔

اسلام عورت کو اس گھٹیا طریقے سے نہیں پرکھتا۔ بلکہ اسلام میں وہ عورت ''کامیاب عورت'' کہلاتی ہے جو اللہ کے احکامات کو پورا کررہی ہوتی ہے۔ وہ خود کو مرد سے کمتر نہیں سمجھتی بلکہ وہ معاشرے میں اپنے کردار اور فرائض کو اختیار کرنے کی متمنی ہوتی ہے۔ وہ کام تو کرسکتی ہے لیکن اسے وہ اپنی کامیابی سے نہیں جوڑتی اور نہ ہی اپنے رتبے کو اپنے کیریئر سے ماپتی ہے۔ وہ اللہ کے احکامات کو بجالانے کو اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتی ہے۔ ایسی عورت ہی ''کامیاب عورت'' ہے۔ ●●

دعوت

کا

اگلا شمارہ

''لوک سبھا انتخابات میں مسلم سیاسی گروپوں کا رول''

کے جائزے پر مشتمل ہوگا۔

کامیاب عورت کا مغربی اور اسلامی نقطہ نظر

محمد شہاب الدین

گزشتہ صدی سے یہ موضوع مسلسل زیر بحث ہے کہ معاشرے میں ''کامیاب عورت'' کون ہوتی ہے؟ مغربی معاشرے میں اُس خاتون کو ''کامیاب عورت'' قرار دیا جاتا ہے جو کامیاب معاش رکھتی ہو، جو مالی طور پر خودمختار ہو اور جو گھر اور کار کی مالک ہو۔ لہٰذا ایسی خواتین اس معاشرے میں رول ماڈل (Role Model) کے طور پر جانی جاتی ہیں جو مذکورہ بالا معیار پر پوری اُترتی ہوں۔ چنانچہ موجودہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی بیوی اور بظاہر چار بچوں کی ماں چیری بلیئر جو ایک کامیاب وکالت کا کیریئر (Career) رکھتی ہے۔ اس کا ذکر اکثر رول ماڈل کے طور پر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اُس معاشرے میں یہ رائے بھی عام ہے کہ باپ یا شوہر پر انحصار کرنا عورت کو معاشرے میں کم تر درجے کا مالک بنا دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ عورت جو ماں یا بیوی ہونے کے ساتھ کوئی بھی ذریعہ معاش نہیں رکھتی اس کی کوئی اہمیت نہیں یا یہ کہ وہ ایک ناکام عورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اُس معاشرے میں جب کسی عورت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ''آپ کا پیشہ کیا ہے؟'' یا ''آپ کیا کرتی ہیں؟'' تو وہ یہ جواب دیتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتی ہیں کہ ''میں صرف ماں ہوں'' یا ''میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی معاشرے میں ایک پیشہ ور خاتون کو مال جنس (Commodity) کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اس کی اہمیت کا دارومدار اس چیز پر ہے کہ وہ معیشت میں کتنا حصہ ڈال رہی ہے۔

اسی طرح مغربی معاشرے میں تذکیر وتانیث کا معاشرے میں کردار کے حوالے سے بہت بڑی تبدیلی آئی ہے کہ ایک خاندان میں عورت کو بھی کمانے کا اتنا ہی حق ہونا چاہئے جتنا کہ مرد کو۔ چنانچہ ۱۹۹۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کی رپورٹ کے مطابق لوگوں کی اس بارے میں رائے کہ یہ صرف مرد کا کام ہے کہ وہ اپنے خاندان کی کفالت کرے، ۱۹۸۴ء میں ۶۵ فیصد تھی جو کہ ۱۹۹۴ء میں کم ہو کر ۴۳ فیصد رہ گئی۔ اس وقت برطانیہ میں ۴۵ فیصد خواتین کام کرتی ہیں اور امریکہ میں ۷ء۸۷ فیصد خواتین کام کرتی ہیں۔ جب کہ مغربی حکومتیں کامیاب عورت کے اس معیار کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آتی ہیں۔ لہٰذا ایسی عورتوں کی تعریف کی جاتی ہے جو کہ اپنی اس زندگی میں ایک کامیاب کیریئر حاصل کر چکی ہوں۔ مزید برآں ایسی ماؤں کے لئے معاشی فوائد کا اعلان بھی کرتی ہیں جو کام کرنے والوں میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔ چنانچہ موجودہ برطانوی حکومت نے ایک پالیسی بعنوان ''قومی اسٹریٹجی برائے بچوں کی دیکھ بھال'' متعارف کرائی ہے کہ جس کے مطابق بچوں کی دیکھ بھال کے لئے بہت سی جگہیں فراہم کی جائیں گی تاکہ وہ عورتیں جو کام کرتی ہیں اپنے بچوں کو دیکھ بھال کے لئے ان جگہوں پر چھوڑ سکیں۔ اسی طرح انہیں مالی فوائد اور ٹیکس میں چھوٹ بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال پر اٹھنے والے اخراجات کو برداشت کرسکیں۔ چنانچہ ''Full Time Mothers'' نامی تنظیم کا سربراہ جل کربی کہتا ہے کہ ''ایسی عورتوں کے لئے مالی فوائد ہیں جو کام کرتی ہیں لیکن گھر بیٹھی عورتوں کے لئے کوئی مالی فائدہ نہیں۔''

بدقسمتی سے وہ مسلم خواتین جو مغرب میں رہ رہی ہیں وہ اس سوچ سے بہت متاثر ہوئی ہیں کہ اپنی اس زندگی میں ایک کامیاب کیریئر حاصل کرنا باقی تمام مقاصد سے بڑھ کر ہے۔ وہ بھی اب یہ یقین رکھتی ہیں کہ یہ کیریئر ہی ہے جو کہ عورت کو معاشرے میں مقام اور عزت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شادی دیر سے کرتی ہیں یا وہ شادی کرتی ہی نہیں کیونکہ وہ شادی کو اپنے کیریئر کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ وہ بچوں کی پیدائش بھی دیر سے کرتی ہیں اور تھوڑے بچے پیدا کرتی ہیں یا بچے پیدا ہی نہیں کرتیں۔ اور وہ خواتین جو کوئی کام نہیں کرتیں وہ اپنے معاشرے کی طرف سے مستقل دباؤ کا شکار رہتی ہیں کہ انہیں بھی کوئی کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہاں پر موجود مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سوچ سے متاثر ہو چکی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے والدین اپنی بیٹیوں کو کامیاب کیریئر اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، جب کہ ممکن ہے کہ وہ لڑکی جلدی شادی کرنے کے حق میں ہو اور ماں کا کردار نبھانے کو ترجیح دیتی ہو۔

''کامیاب عورت'' کے اس مغربی معیار کا اسلامی دنیا پر اثر:

مغرب چاہتا ہے کہ مسلمان اُن کے دیئے ہوئے معیارات پر اپنی زندگی کو پرکھے۔ چنانچہ میڈیا کے ذریعے وہ مغربی طرز زندگی کو پھیلانے کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی یہ رائے پھیلتی چلی جارہی ہے کہ کامیاب خاتون وہ ہے کہ جس کا اپنا ایک کیریئر ہو۔

مغرب چاہتا ہے کہ مسلمان اُن کے دیئے ہوئے معیارات پر اپنی زندگی کو پرکھے۔ چنانچہ میڈیا کے ذریعے وہ مغربی طرز زندگی کو پھیلانے کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے ہے۔ جس کا اثر یہ ہوا ہے کہ مسلم ممالک میں بھی یہ رائے پھیلتی چلی جارہی ہے کہ کامیاب خاتون وہ ہے کہ جس کا اپنا ایک کیریئر ہو۔

حال ہی میں ایک میگزین Working Mother میں افغان عورتوں کے حوالہ سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں لکھا ہے کہ ''بہت سی خواتین معاشی ضرورت کے تحت کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ لیکن افغان خواتین کا ایک بڑھتا ہوا گروہ اپنے کیریئر کے دوبارہ حصول کی کوشش کر رہا ہے۔ تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے، جس کو وہ طالبان کی حکومت کے دوران چھوڑنے پر مجبور تھیں'' اس مضمون میں ایک لڑکی کا انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ افغان خواتین کی اپنے حقوق کی لڑائی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ وہ لڑکی کہتی ہے کہ ''میں نے ان خواتین کو بتایا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں کیونکہ تم مردوں کے برابر ہو۔'' وہ مزید کہتی ہے کہ میں نے انہیں کہا کہ ''برقعے میں مت بیٹھو، گھروں میں مت بیٹھی رہو، باہر نکلو اور اپنے بچوں اور خاوند کو یہ ثابت کر کے دکھاؤ کہ تم ایک عورت ہو، تم ہر کام کرسکتی ہو اور اپنے فیصلے بھی خود کرسکتی ہو۔''

مزید یہ اسلامی دنیا میں ایسے تصورات کو پروان چڑھانے کے لئے UNIFEM، اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (UNDP)، اقوام متحدہ کا فنڈ برائے آبادی (UNPF) اور دوسرے غیر سرکاری ادارے حوصلہ افزائی کرتے نظر آتے ہیں۔ 2001ء میں UNDP کی طرف سے پاکستان میں ''میڈیا میں عورت کو کیسے پیش کیا جائے'' کے عنوان سے ایک سروے کیا گیا جس میں یہ رائے دی گئی کہ ٹی وی کے ڈراموں اور پروگراموں میں خواتین کو بہادر اور پُر اعتماد کردار میں دکھایا جانا چاہئے اور اس سوچ کو ختم کیا جانا چاہئے کہ ایک کامیاب کیریئر کی حامل خاتون آئیڈیل بیوی یا ماں نہیں بن سکتی۔

''کامیاب عورت'' کے مغربی معیار کا اصل ماخذ:

یہ سوچ کہ کامیاب کیریئر کی حامل خاتون ہی ''کامیاب عورت'' ہوتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام سے لیا گیا ہے۔ جس میں مادی فائدے اور نفع کی بنیاد پر کامیابی کو جانچا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خاتون جو کاروبار کرتی ہے، ڈاکٹر ہے، وکیل ہے یا وہ اکاؤنٹنٹ ہے تو وہ کامیاب عورت ہے۔ کیونکہ یہ معاشی لحاظ سے معاشرے میں اپنا حصہ ڈالتی ہے۔ چاہے وہ یہ حصہ خدمات کی شکل میں دے رہی ہو یا پھر ٹیکس کی شکل میں حکومت کو ادا کر رہی ہو۔ اسی طرح ان کے نزدیک ایک گھریلو ماں یا بیوی معاشرے میں کوئی حصہ نہیں ڈال رہی ہوتی۔ اس لئے اسے منفی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے نہ کہ کامیابی کی علامت کے طور پر۔ ۲۰۰۲ء میں انسٹی ٹیوٹ آف فسکل اسٹڈیز (حکومت برطانیہ کا مشاورتی ادارہ) نے ایک رپورٹ جاری کی جس میں یہ واضح طور پر کہا گیا کہ ''بچوں کی موجودگی ماؤں کے لئے روزگار کی فراہمی کی راہ میں رکاوٹ ہے اور بچوں کی دیکھ بھال کی قابل برداشت اور آسان رسائی کی کمی کی وجہ سے ماؤں کی کمائی پر الٹا اثر پڑا ہے۔ صاف گوئی تو یہ ہے کہ موجودہ اسٹریٹجی کام نہیں کر رہی اور اس کا خمیازہ معاشی نقصان کی شکل میں موجود ہے۔''

تذکیر وتانیث کا معاشرے میں کردار کی جو نئی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاتون چاہے وہ ماں ہو یا بیوی اسے اپنا کیریئر جاری رکھنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ ایک مرد کو شوہر یا باپ ہونے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ تعریف مرد اور عورت کی برابری کے مغربی تصورات سے لی گئی ہے۔ یہ تصوریوں ہیں کہ یہ دیکھنے کی بجائے کہ معاشرے میں عورت اور مرد کو کیسے دیکھا جاتا ہے بلکہ دونوں کا کردار برابر ہونا چاہئے اور اس کا فیصلہ انفرادی ہونا چاہئے۔ اسی سے یہ نکلتا ہے کہ عورت کو مرد کے برابر روزگار کی فراہمی کا حق ہونا چاہئے اور خواتین وہ کام اور نوکریاں بھی کرسکتی ہیں جو مرد کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی شادی سے متعلق معاملات کا فیصلہ بھی خود کرے یعنی کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرے گی یا کمائے گی۔ برابری کا یہ تصور اپنے اندر ایک ظالمانہ روش رکھتا ہے جو کہ انسانی عقل سے بنائے گئے سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کو بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ تصور اس متعصب ماحول کی پیداوار ہے جب انگریز معاشرے میں عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا اور عورت انتہائی مشکل زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۰ء تک انگریز قوانین کے تحت عورت کو شہری تک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین کے حقوق اور ان کے لئے برابری کے حق کے لئے آواز بلند کی گئی اس یقین کے ساتھ عورت صرف اسی طرح بہتر معیار زندگی حاصل کر سکے گی جب اس کا اپنا کیریئر ہوگا، وہ مالی طور پر خودمختار ہوگی اور معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کام کرنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ وہ ملک کی معیشت میں اپنا حصہ ڈالیں۔ مغربی طاقتوں نے عثمانی خلافت کے اندر بھی عورتوں کے حقوق اور برابری کی آواز اٹھائی جس کا مقصد عورتوں کا معیار زندگی بلند کرنے کی بجائے اسلامی ریاست پر کاری ضرب لگانا تھا۔ مغربی مصنف برنارڈلیوس اپنی کتاب ''The Middle East'' کے باب ''آزادی سے آزادی تک'' میں رقم طراز ہے کہ ''عورتوں کی آزادی کی ایک بڑی وجہ معاشی ضرورت تھی۔ معیشت کے اندر جدت پسندی زنانہ لیبر کی ضرورت کو سامنے لائی اور جسے جدید جنگ میں فوجی بھرتی کی وجہ سے کافی بڑھاوا دیا گیا۔ عورتوں کی معیشت میں شمولیت اور معاشرتی تبدیلیاں اسی کا نتیجہ ہیں جو جنگ کے دوران اور بعد میں بھی جاری رہیں بلکہ اسی وجہ سے عورتوں کے حق میں قانونی تبدیلیاں بھی کر دی گئیں۔ یہ کچھ حد تک معاشرتی اور خاندانی زندگی پر اثر انداز بھی ہوئیں ہیں۔''

''کامیاب عورت'' کے اس نقطہ نظر کا خاندانی ڈھانچے پر اثر:

کیریئر کی تلاش کو عورت کی زندگی کا اصل مقصد بنا دینے کی وجہ سے مغربی معاشرے میں بہت سے مسائل نے جنم لیا ہے، خصوصاً اس کی وجہ سے خاندانی ڈھانچے پر نہایت ہی مہلک اثر ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے شادی شدہ زندگی میں تناؤ پیدا ہو رہا ہے اور چونکہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھ کم وقت گزارتے ہیں، اس لئے طلاق کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نظریہ کی وجہ سے بچوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے اور والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ کم وقت گزارنے کی وجہ سے بچوں اور والدین کے درمیان تعلقات میں سنگین قسم کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

یہ مسائل ان مسلم خاندانوں پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں جو اس نظریے سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ شوہر اور بیوی کے کردار کی صحیح وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان بحث ومباحثہ جاری رہتا ہے اور یہی بحث بالآخر طلاق کا باعث بن جاتا ہے۔ بچوں کے معاملے میں ماں اور بچے کا جو قریبی تعلق ہوتا ہے اور جسے مزید پروان چڑھنا چاہئے لیکن اس نظریے کی وجہ سے ماں کی طرف سے بچے کی پرورش اسلامی تہذیب کے مطابق نہیں ہو پاتی۔ اس کی وجہ ماں کا بچے کے ساتھ کم وقت گزارنا ہے اور والدین اپنا کیریئر بنانے کے چکر میں بچوں کو ایسی جگہوں پر داخل کرا دیتے ہیں جہاں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ بچے غیر اسلامی شناخت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدین کا کہنا نہ ماننا، انہیں نظر انداز کرنا، شراب پینا اور منشیات کا استعمال جیسے برے کام مغربی معاشرے میں موجود ان مسلم خاندانوں میں عام ہیں جہاں ''کامیاب عورت'' کا یہ نظریہ اپنایا جارہا ہے۔

''کامیاب عورتوں'' کی خستہ حالی:

وہ لوگ جنہوں نے اصل میں خواتین اور مردوں کے درمیان برابری کا تصور دیا ہے ان کا یقین ہے کہ برابری کا یہ تصور خواتین کو ان کی خستہ حالی سے باہر نکالتا ہے۔ وہ خستہ حالی جس میں مغربی عورت کئی سالوں سے مبتلا تھی اور جسے ریاست کا شہری تک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس تصور کو اپنانے کے بعد بھی کام کرنے والی عورتیں کوئی کم خستہ حال نہیں ہیں، بس وجوہات مختلف ہیں۔ بچوں کی پیدائش میں دیر یا بچے پیدا ہی نہ کرنا یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کیونکہ کیریئر اس بات سے متفق نہیں کہ تولیدی جبلت ہر عورت میں پائی جاتی ہے بلکہ اس کے نزدیک یہ جبلت خستہ حالی کا باعث ہے۔ وہ کیریئر وومین جن کے بچے ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کے ساتھ کم وقت گزارنے کی وجہ سے مستقل طور پر ندامت محسوس کرتی رہتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ خود کو بیوی، ماں اور کام کے درمیان بہت زیادہ مصروف پاتی ہے۔ بہت سے گھروں میں ایک کیریئر وومین اپنی گھر کی ذمہ داریوں کو کم نہیں کر پاتی۔ وہ اپنے کیریئر کو جاری رکھنے کے لئے کام کرتی ہے لیکن گھر کے کام ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر پاتی۔

چنانچہ خواتین کا سارا دن ایک کام سے دوسرے کام کو کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ اپنی فیملی کے لئے ناشتہ تیار کرنا، شوہر اور بچوں کے لئے لنچ تیار کرنا، بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجنا، اپنی نوکری کے لئے جانا، دفتر میں پورا دن کام کرنا، پھر اسکول سے بچوں کو لینے جانا، رات کا کھانا تیار کرنا، بچوں کا بستر تیار کرنا اور اگلے دن کی تیاری کرنا۔ وہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ اپنا کوئی بھی کام بہتر طور پر نہیں کر پاتیں، کیونکہ ایسی خاتون بہت زیادہ تھکاوٹ اور ٹینشن محسوس کرتی ہے۔ ایک مغربی مصنفہ Lisa Belkin اپنی کتاب "Life's Work: Confessions of an undbalanced Mom" میں لکھتی ہیں کہ ''ہم میں سے کوئی ایک خاتون بھی ۱۰۰ فیصد وقت اپنی نوکری کو نہیں دے سکتی، نہ ۱۰۰ فیصد اپنی فیملی کو دے سکتی ہیں اور نہ ہی ۱۰۰ فیصد خود اپنے لئے نکال سکتی ہیں۔'' یہ ان کامیاب عورتوں کی خستہ حالی نہیں تو کیا ہے؟ مغرب نے آزادی کے نام پر اسے ایک معاشی جنس بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔

برابری کے تصور کی حقیقت:

یہ تصور کہ معاشرے میں تذکیر وتانیث کی برابری خواتین کے لئے ترقی کی راہ متعین کرتا ہے ایک فاش غلطی ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے کسی بھی نظام میں انفرادی لحاظ سے سب کو برابری کا حق دینا ممکن نہیں چاہے یہ مرد اور عورت کے درمیان ہو یا کالے اور گورے کے درمیان یا پھر جوان اور بوڑھے کے درمیان، کیونکہ انسان جب بھی خود قانون بناتا ہے وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بگاڑ کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں ۳۰ سال سے برابری کے حوالے سے قانون موجود ہیں لیکن ان معاشروں میں خواتین مردوں کے جیسا کام کرنے کے باوجود کم تنخواہ لیتی ہیں۔ یہ اس چیز کو واضح کرتا ہے کہ پوری صدی میں خواتین کے حقوق اور برابری پر بات کی گئی اور پھر بھی بیسویں صدی میں برطانیہ میں صرف ۴ فیصد خواتین جج کے عہدے پر فائز تھیں، ۱۱ فیصد منیجر FTSE کی ۱۰۰ میں سے دو خواتین ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھیں۔

مزید یہ کہ مرد اور عورت پر برابری کیسے لاگو ہو سکتی ہے جو جسمانی اور اعضائی لحاظ سے فطری طور پر ہی مختلف ہیں۔ جیسا کہ ایک مصنف لکھتا ہے کہ ''برابری کے اس تصور میں ایک فطری دباؤ موجود ہے، جو پہلے سے ہی فرض کر لیتا ہے کہ اس میں یکسانیت ہے۔'' یہ ایسا ہی ہے کہ یہ تجویز کر لینا کہ سورج اور زمین چاہے فطرت میں اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا کام ایک جیسا ہونا چاہئے جب زندگی میں کردار اور کام اس طرح سے طے کئے جائیں جس میں مرد اور عورت کی فطرت میں اختلاف کو بروئے کار نہ لایا جائے تو یہ فیصلہ مصیبت اور خستہ حالی کا سبب بنتا ہے جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔

اسلام اور ''کامیاب عورت'' کا صحیح تصور:

اسلام کسی عمل، کام یا شخص کو اس بنیاد پر نہیں جانچتا کہ وہ ریاست کی معیشت میں کتنا حصہ ڈال رہا ہے۔ اسلام کسی مرد یا خاتون کو جانچنے کا پیمانہ یہ بتاتا ہے کہ ان کے اعمال اللہ کے حکم کے مطابق ہیں یا نہیں اور ان کے تقویٰ کا معیار کیا ہے؟ حضورؐ نے اپنے آخری خطبہ حج میں فرمایا ''کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی برتری حاصل ہے اور نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری حاصل ہے۔ سوائے تقویٰ اور اصل اعمال کی بنیاد پر'' اس لئے کامیاب وہ ہے جو کہ پُرخلوص ہو کر اللہ کے احکامات کی پیروی کرے، اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ یہ ہمارے اعمال ہی ہوں گے جو مرنے کے بعد ہمارے لئے جنت یا دوزخ کا فیصلہ کرائیں گے۔ یہی کامیابی کا صحیح معیار ہے۔

اسلام دین فطرت ہے چنانچہ جن معاملات میں مرد اور عورت کی فطری صلاحیتیں ایک جیسی ہیں ان معاملات میں اسلام نے ان پر فرض بھی ایک جیسے عائد کئے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ تاہم جہاں فطرت میں فرق پایا جاتا ہے تو وہاں فرائض بھی مختلف عائد ہوتے ہیں، اس لئے خاوند اور باپ پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرے اور مالی طور پر ان کی کفالت کرے۔ جب کہ عورت کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند اور بچوں کی دیکھ بھال کرے، ان کی فلاح وبہبود کا خیال رکھے اور اپنے بچوں کی پرورش اسلامی تہذیب کے مطابق کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے، پس نیک فرمانبردار عورتیں خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت الٰہی نگہداشت رکھنے والی ہیں۔'' (النساء: ۳۴)

اللہ نے مرد وزن کی ذمہ داریاں بانٹ دیں۔ چنانچہ اسلام نے مرد پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ ماں یا بیوی کے کردار سے بڑھ کر نہیں بلکہ اس پر عائد کی گئی ذمہ داری کا وہ جوابدہ ہے۔ دونوں فرائض ایک دوسرے کے لئے قابل قبول ہیں اور خاندان کو بااحسن طریقے سے چلانے کے لئے نہایت ہی ضروری ہیں تاکہ معاشرہ صحیح طور پر کام کرسکے اور اس میں سکون ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہیں: ''اور اس چیز کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کو ان کے کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کے کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے۔'' (النساء ۳۲)

برابری کا مغربی تصور انسانی اختراع ہے جو فطرت میں بگاڑ پیدا کرتا ہے اور اسلام میں ایسے تصور کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اسلام میں تمام احکامات خالق باری تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں جو مرد اور عورت دونوں کے لئے منصفانہ ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام بنی نوع انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ معاشرے میں اپنی مرضی یا دلی پسند اور ناپسند کے مطابق اپنے فرائض منصبی کا تعین کرے، بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کو من وعن قبول کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ اور اس کا رسولؐ جب کوئی فیصلہ کریں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لئے اس فیصلے میں کوئی اختیار نہیں (یاد رکھو) اللہ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔''

(الاحزاب: ۳۶)

اسلام میں ایک عورت کیلئے جائز پیشے:

اسلام میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک عورت کوئی پیشہ اختیار کرسکتی ہے اگر وہ ماں اور بیوی جیسے اپنے بنیادی فرائض کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ تاہم اسلام خواتین کو چند مخصوص پیشے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

(۱) حکمراں کا عہدہ جیسا کہ خلیفہ، والی یا عامل: یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلامی

باقی صفحہ ۶ پر

اسلام دین فطرت ہے چنانچہ جن معاملات میں مرد اور عورت کی فطری صلاحیتیں ایک جیسی ہیں ان معاملات میں اسلام نے ان پر فرض بھی ایک جیسے عائد کئے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ تاہم جہاں فطرت میں فرق پایا جاتا ہے تو وہاں فرائض بھی مختلف عائد ہوتے ہیں، اس لئے خاوند اور باپ پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرے اور مالی طور پر ان کی کفالت کرے۔ جب کہ عورت کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند اور بچوں کی دیکھ بھال کرے، ان کی فلاح وبہبود کا خیال رکھے اور اپنے بچوں کی پرورش اسلامی تہذیب کے مطابق کرے۔

پنجۂ یہود ٹوٹ جائے گا؟

حافظ محمد ادریس

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں جو اشعار لکھے، ان میں درد دل کے ساتھ حکمت ودانش اور امت مسلمہ کے لئے پیغام عمل کی فراوانی ہے۔ ضرب کلیم کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور رباعیاں بہت موثر ہیں، تین اشعار کی ایک نہایت چھوٹی نظم بعنوان ''فلسطینی عرب'' ملاحظہ فرمائیے:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے!
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے!
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش ولذت نمود میں ہے!

علامہ اقبال نے جن فلسطینیوں کو مخاطب کیا تھا انہی فلسطینیوں کی لازوال قربانی، خودی اور خودداری، لذت، نمود سے سرشاری اور بے مثال جرأت نے آج پنجۂ یہودی کا پول بھی کھول دیا ہے اور جنیوا ولندن میں زندہ ضمیر انسانوں کے دلوں میں بھی اپنے لئے مقام پیدا کرلیا ہے۔ مسٹر فرنانڈو بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ ان سطور میں آج کے مغرب کی تاریک اور روشن دونوں تصاویر قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مطلوب ہے تاکہ امت ہوشیار بھی رہے اور حوصلہ بھی نہ ہارے۔

اسرائیل کی صہیونی ریاست ظلم وستم کی علامت بن چکی ہے۔ غزہ میں ڈھائی جانے والی قیامت کبریٰ تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ یہودی صہیونی، جرمنی کے ہولوکاسٹ کا رونا بہت روتے ہیں اور اگر کوئی اس کا انکار کردے تو صہیونیوں کے دست بستہ غلام، امریکی ویورپی روشن خیال، اسے مجرم اور گردن زدنی قرار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ اس میں خیر کی رمق باقی رہتی ہے۔ جو معاشرے بے انصافی اور عصبیت کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں، ان کے اندر بھی کہیں نہ کہیں کوئی ٹمٹماتی ہوئی شمع نظر آ جاتی ہے۔

برطانوی پارلیمان کے رکن جارج گیلوے مذہباً عیسائی ہیں مگر ان کی انسانیت دوستی انہیں عصبیتوں سے اوپر اٹھا کر ایک غیر جانب دار اور بھلے انسان کے روپ میں پیش کردیتی ہے۔ جارج گیلوے نے ہمیشہ مغربی وامریکی بلاک کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ عراق پر امریکی یلغار، افغانستان پر اتحادی افواج کے حملوں اور فلسطینیوں کے بنیادی حقوق پر اسرائیلیوں کے شب خون پر اس زندہ ضمیر انسان نے ہمیشہ کھل کر تنقید کی ہے۔ پچھلے عرصے میں غزہ پر ہونے والے صہیونی مظالم کے خلاف تو اس نے صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ادا کردیا۔ برطانیہ کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں انہوں نے اس موضوع پر کئی مذاکروں کا اہتمام کیا اور ان میں نہایت فعال کردار ادا کیا۔ وہ یہودیوں اور ان کے ایجنٹوں کے نزدیک نفرت کے سوداگر گردانے جاتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ خود کو روشن خیال اور وسیع الظرف کہنے والے مغربی معاشرے جب اپنی تنگ نظری اور تاریک فکری کا اظہار کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کی انسانیت مرچکی ہے۔ جارج گیلوے ایک لیکچر ٹور پر کینیڈا جارہے تھے۔ برطانوی شہری اور رکن پارلیمانی ہونے کے باوجود انہیں غیر پسندیدہ شخص قرار دے کر کینیڈا میں ان کے داخلے اور ویزے کا راستہ مسدود کردیا گیا۔ ان کو داخلہ اور ویزہ دینے سے انکار کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کینیڈا میں امیگریشن کے وزیر جیسن کینی نے لکھا کہ گیلوے غیر پسندیدہ شخصیت ہیں اور اس کی وجوہات میں بیان کیا کہ: (۱) گیلوے نے افغانستان میں کینیڈا کے فوجیوں کی موجودگی پر شدید تنقید کی ہے اور وہ وہاں موجود اتحادی فوجیوں کو غاصب، ظالم اور حقوق انسانی کے مجرم قرار دیتے رہے ہیں۔ (گویا یہ نہ غاصب ہیں، نہ ظالم اور مجرم!)

(۲) گیلوے فلسطین کی انتہا پسند تنظیم حماس کے حامی ہیں۔ وہ اس کے حق میں زبانی وتحریری آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ یہ تنظیم بھی غیر پسندیدہ ہے اور اس کی حمایت کرنے والے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

مسٹر گیلوے کے اس دورے کا مقصد کینیڈا میں ایک لیکچر تھا جس میں وہ غزہ میں ڈھائے جانے والے صہیونی مظالم کی تفصیل بیان کرنا چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ جارج گیلوے نے اسرائیلی جارحیت کے دوران غزہ کا دورہ کیا تھا۔ ان کے پاس مستند معلومات، اعداد وشمار اور دل دہلا دینے والی تصاویر اور فوٹیج تھیں۔ جارج گیلوے پر پابندی اور اس کے ساتھ لغو الزامات تو لگا دیئے گئے ہیں مگر وہ شکست ماننے والی شخصیت نہیں ہیں۔ اس سے قبل اپنے اوپر لگائی جانے والی ناروا پابندیوں کے خلاف وہ عالمی عدالت میں ہرجانے کے کیس مختلف حکومتوں حتیٰ کہ امریکہ کے خلاف جیت چکے ہیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے اعلان کیا ہے کہ کینیڈا کے وزیر نے ان کی توہین کی ہے۔ ان کی عزت وشہرت کو بے بنیاد الزامات سے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے وہ اس وزیر کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کریں گے۔

مغربی ممالک میں امیگریشن اور حصول ویزا کے قوانین بہت زیادہ سخت کردیئے گئے ہیں مگر کینیڈا کی حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ اس معاملے میں بہت فراخ دل ہے۔ اس واقعے سے آپ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ ''مہذب معاشرے'' کس قدر فراخ دل اور وسیع الظرف ہیں۔

اس واقعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغرب میں حکومتیں اور معاشرے بحیثیت مجموعی صہیونیوں کے مقابلے پر اندھے، بہرے اور گونگے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات اور موقف کی تائید مغرب سے بھی ہو رہی ہے۔

●●

POSTED ON 11 June 2009 AT DELHI R.M.S. LICENCE NO. U (D.N.)- 41 / 2009 - 11 TO POST WITHOUT PRE PAYMENT PAGES-8.

۱۳ر جون ۲۰۰۹ء

TELEGRAM : ADDAWAH NEW DELHI-110025
PHONES: Editor: 26958816, Manager: 26949539, Fax:26958816
E-mail:- dawattrust@yahoo.co.in , dawatnews@indiatimes.com

DAWAT SEHROZA
NEW DELHI-110025

R.N.I. No.522/57
POSTAL REGISTRATION No.
DL (S) - 05 / 3128 / 2000 - 2011 & DL (S) - 05 / 3266 / 2006-08 (Foreign Post

(احوال وکوائف)

ایک دلچسپ واقعہ

شفیق الرحمٰن

پچھلے دنوں ایک خبر یہ آئی کہ دختر مشرق یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو امریکہ کے اس 'ڈیتھ اسکواڈ' (دستۂ مرگ) نے راستے سے ہٹایا تھا جس کی کمان امریکہ کے سابق نائب صدر ڈک چینی کے ہاتھ میں تھی، اس کا حکم بھی انھوں نے ہی دیا تھا۔ مذکورہ خبر کے مطابق دختر مشرق کے لئے یہ حکم اس لئے صادر کیا گیا کیونکہ انھوں نے ایک ناقابل معافی 'جرم' کیا تھا۔ اس خبر میں اس 'جرم' کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے۔ محترمہ کا وہ 'جرم' یہ تھا کہ انھوں نے ایک عربی ٹی وی چینل (الجزیرہ) کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں یہ کہہ دیا تھا کہ اسامہ بن لادن اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ خبر یہ بتاتی ہے کہ یہ امریکی مفادات پر کاری ضرب تھی کیونکہ اس وقت امریکہ اسامہ بن لادن کو زندہ رکھنا چاہتا تھا، اس کے منصوبے کے مطابق دنیا کو اس کی بھنک بھی نہیں لگنی چاہئے تھی کہ اسامہ بن لادن نام کا اب کوئی وجود اس دنیا میں باقی نہیں رہ گیا ہے، لیکن اس کا انکشاف کر کے گویا محترمہ نے امریکی حکمت عملی کو ناکام بنانے کی کوشش کی تھی اور یہ بہت بڑا جرم تھا۔ ایسا جرم جس کو کبھی اور کسی حالت میں معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ بات افغانستان میں امریکی افواج کی موجودگی کے قانونی جواز کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی، اور اس کی وجہ سے امریکہ کے لئے بہت سارے مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔

پاکستان کے معاصر روزنامہ 'نیشن' نے یہ خبر دی کہ یہ انکشاف کسی اور نے نہیں بلکہ گھر کے آدمی یعنی امریکہ کے ایک نامور اور سرکردہ صحافی سیمور ہرش نے کیا ہے، جو سراغ رسانی سے متعلق صحافت کی دنیا کے ایک لیجنڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ سیمور ہرش مغربی دنیا میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور دنیا ان سے خوف بھی کھاتی ہے کیونکہ مشہور ہے کہ ان کے کشکول میں ایسے ایسے راز بند ہیں کہ اگر اسے کھول دیا جائے تو دنیا زیر و زبر ہوسکتی ہے۔ ایوانہائے اقتدار میں زلزلہ آسکتا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی ایک دلچسپ خبر ہے کہ ان کا تعلق ایک یہودی گھرانے سے ہے، خیر، معاصر نیشن کو یہ خبر امریکی ذرائع سے ہی ملی تھی، اور جن امریکی ذرائع سے نیشن نے یہ خبر لی تھی انہیں کسی نامعلوم عربی ٹی وی چینل سے یہ 'مصالحہ' ہاتھ آیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ سیمور ہرش نے اس ٹی وی چینل کو 'چپکے' سے یہ خبر دی تھی یا یوں کہئے کہ انھوں نے کان میں یہ بات بتادی تھی، یوں جو بات 'چپکے' سے کہی گئی تھی وہ راز پورے چمن کو معلوم ہوگئی، سیمور ہرش کے اس انکشاف میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ لبنانی صدر رفیق حریری بھی اسی طرح کی ایک سازش کا شکار ہوئے تھے اور اس میں اسرائیلی قیادت کا بھی ہاتھ تھا۔

توقع کے عین مطابق اس انکشاف نے ایک قیامت برپا کردی، مغرب کے ایوانوں میں اور خاص طور پر امریکہ کے ایوان اقتدار میں ایک زلزلہ آگیا۔ یہ واقعہ ایک ایسے وقت پیش آیا جب امریکہ میں اس پر بحث جاری تھی کہ صدر بش کے زمانے میں دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر امریکہ کے خفیہ اداروں نے جو کارروائیاں کی ہیں اور تفتیش کا جو ڈھنگ اختیار کیا تھا اس کے بارے میں اب سرکاری طور پر کیا موقف اختیار کیا جائے۔ گوانتاناموبے کے عقوبت خانے کو بند کرنے کے حوالے سے بہت سارے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اس کے چند ہی روز بعد قومی سلامتی کو یقینی بنانے کے سوال پر امریکہ میں ایک قومی مباحثے کا بھی ایک طرح سے آغاز ہوگیا، اس لئے کہ ۲۱ر مئی کو صدر بارک حسین اوباما نے جو تقریر کی اس کے فوراً ہی بعد سابق نائب صدر ڈک چینی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، جو صدر اوباما سے بالکل مختلف تھا اور یہ دونوں تقریریں امریکی ٹی وی چینل پر دکھائی گئیں، لیکن سیمور ہرش کے انکشاف کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دوسرے ہی دن ان کی طرف سے تردیدی بیان آگیا، معاصر نیشن نے بھی اس پر مسٹر ہرش سے معافی طلب کرلی، لیکن نہ سیمور ہرش کی جانب سے اس 'دروغ گوئی' پر ہتک عزت کا معاملہ اٹھایا گیا نہ ہرجانہ کا مطالبہ کیا گیا، اور نہ امریکی حکومت کی طرف سے ایسی کوئی بات کہی گئی، گویا سیمور ہرش کی تردید اور نیشن کی طرف سے معافی طلب کئے جانے پر ہی معاملہ کو رفع دفع کردیا گیا۔ ●●

سول سروسز کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

جے پور راجستھان سے مولانا فضل الرحیم مجددی ندوی نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ امسال انہوں نے اپنی چیئرمین شپ میں قائم کریسنٹ اکیڈمی کے تحت جن طلباء کو ملک کی اعلیٰ سول سروس I.A.S. اور I.P.S. وغیرہ کے لئے کوچنگ کے بعد امتحانات میں بٹھایا تھا اس میں جملہ کامیاب ہونے والے ۷۹۱ طلباء میں ۳۱ مسلم طلباء تھے اور اس میں سے ایک تہائی یعنی دس طلباء خود ان کی اکیڈمی کے تھے، امسال پورے ملک سے تین لاکھ اٹھارہ ہزار طلباء نے ان امتحانات میں اپنی قسمت آزمائی تھی، اس خوش کن خبر کو سن کر میرے دل پر تین طرح کے اثرات مرتب ہوئے ایک مسرت کا، دوسرا حیرت کا، تیسرا اطمینان کا۔

مسرت کا اثر فطری تھا کہ ملک کے نظم ونسق میں بتدریج ہی سہی اپنی ملت کی نمائندگی میں اضافہ ہورہا ہے، ۲۰۰۵ء میں اس میں کامیاب مسلم طلباء کی تعداد صرف ۱۲ تھی، صرف تین سال میں یہ ترقی اگرچہ ہماری مسلم آبادی کے اعتبار سے بہت کم سہی لیکن ماضی کے مقابلہ میں نہ صرف غنیمت بلکہ اطمینان بخش بھی کہی جاسکتی ہے، مسرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ سب سے اعلیٰ رینک کے ۵۱ طلباء میں تین مسلم طلباء نے ۲۰/ ۲۶ اور ۵۱ ویں رینک کے ساتھ نہایت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، اس طرح مجموعی طور پر آئی اے ایس (I. A.S) میں مسلم تناسب چار فیصد کے قریب اور سب سے ممتاز ۵۱ طلباء میں ہمارا اوسط بھی ۶ فیصد کے قریب پہنچ گیا، اس میدان میں رینک کی اہمیت اس لئے ہے کہ اسی کے مطابق ان کامیاب طلباء کا ملک کی بڑی پوسٹنگ اور عہدوں کے لئے انتخاب ہوتا ہے ہوتا اور ملک کے اہم اور نازک منصب پر ان کو فائز کیا جاتا ہے، مولانا کی اس خوش کن خبر سے مجھے حیرت اس لئے ہوئی تھی کہ ہمارے علماء ادھر گزشتہ کئی برسوں سے بالخصوص موجودہ حالات میں اور خاص کر ہمارے ملک میں ان کے متعلق کئے جانے والے پروپیگنڈوں اور نام نہاد روشن خیال دانشوروں کی طرف سے ان کو تنگ نظر اور انتہا پسند ثابت کئے جانے اور تعطل وجمود کے حوالے سے ان کو بدنام کئے جانے کی منصوبہ بند کوششوں کے پس منظر میں دین تو دین دنیاوی میدان میں بھی اپنی غیر معمولی کارکردگی سے ایسے نقوش واثرات اور تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے والے وہ کارنامے انجام دے رہے ہیں جن سے ان کے نادان دوست کے ساتھ دانا دشمن بھی خاموش ہورہے ہیں۔ ایک مدرسہ کے فارغ اور خانقاہ نشین عالم نے علماء اور دینی مدارس کو بدنام کئے جانے کے اس پورے منصوبہ کے پس منظر میں جب عصری میدان میں بھی کچھ کر دکھانے کا عزم کیا تو اللہ کی طرف سے ان کی کس طرح غیر معمولی مدد ہوئی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ملک کے ۹۸ فیصد عصری تعلیم یافتہ و مسلم دانشور مل کر ۲۱ مسلم آئی اے ایس نہیں دے سکے اس لئے کہ ان باقی کامیاب دوتہائی مسلم طلباء کی اکثریت نے کسی مسلم ادارہ یا تنظیم کی طرف سے ان امتحانات میں بیٹھ کر کامیابی حاصل نہیں کی تھی بلکہ وہ انفرادی طور پر اس میں شریک ہوئے تھے۔

باقی صفحہ ۶ پر

دعوت

پرنٹر، پبلشر خلیل احمد نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے ایمانین آرٹ پرنٹرز قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۱۱۰۰۰۶ میں برائے دعوت آفسیٹ پرنٹرز چھپوا کر دفتر ''دعوت'' ڈی ۳۱۴، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: پرواز رحمانی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: شفیق الرحمٰن

سب ایڈیٹرس: محمد صبغۃ اللہ ندوی، عقیدت اللہ قاسمی
عمیر کوٹی ندوی، اشرف علی بستوی

بقیہ: سرمایہ دارانہ نظام اور...

یعنی پانچ سو بلین ڈالر کا نقصان پہنچایا۔ یہ دن Black Monday کے نام سے مشہور ہے۔ اس بحران سے چند سال قبل لوگوں کا یہ عام خیال بن چکا تھا کہ کمپنی تب ہی تیزی سے بڑھ سکتی ہے جب دوسری کمپنیوں کو خرید لے۔ کمپنی بڑی رقم تب ہی بنا سکتی ہے جب وہ عوام کو Junk Bonds فروخت کریں۔ Junk Bonds وہ ہوتے ہیں جن کے نقصان کا خطرہ (Loss of Risks) زیادہ ہوتا ہے تاکہ وہ سود کی بڑی قیمت ادا کرسکیں۔ اس طرح Junk Bonds فروخت کرکے پسندیدہ کمپنی کو خریدنا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ۱۴ر اکتوبر کو امریکہ کا تجارتی خسارہ ہونا اور مالیاتی سکریٹری James Baker کا Foreign Exchange Market میں ڈالر میں کمی کرنا اور ۱۹ر اکتوبر کی صبح تک نیویارک اسٹاک ایکسچینج میں Common Stock کی تجارت نہ ہونا۔

The Great Crash 1929:

۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تاریخ میں "Black Thursday" اور The Great Depression کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ۱.۵ ملین لوگوں کی بیروزگاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چار سال کے بعد ۱۹۳۳ء میں بیروزگاروں کی تعداد بڑھ کر تیرہ ملین ہوگئی یعنی پچیس فیصد مزدور بیروزگار ہوئے۔ بیروزگاری کا یہ سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ جب امریکہ نے جنگ عظیم دوم میں شمولیت اختیار کرکے دفاعی روزگاری پیدا کی، اس کریش کی وجہ تھی Speculative Boom جس کی شروعات ۱۹۲۰ء میں ہوئی جس میں ہزاروں امریکیوں نے اسٹاک مارکیٹ میں انویسٹ کیا، پھر جیسے ہی شیئرز کی قیمتیں بڑھنے لگیں اور لوگوں نے انویسٹمنٹ اور تیزی سے کرنا شروع کیا۔ ادھر سٹہ بازاری نے بھی اپنی رفتار تیز کردی اور وہی صورتحال بنی جو اوپر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس پر مزید فیڈرل ریزرو کے چیئرمین بین برنانکے نے کہا ۱۹۲۹ء کی وجہ Tight Monetary پالیسی بھی ہے اور دوسرے ماہر معاشیات کے مطابق یہ بحران اسٹاک مارکیٹ سے شروع نہیں ہوا بلکہ اس میں کچھ ناکام بینک بھی ملوث تھے۔

اگر ہم بیسویں صدی کے بحرانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ اسٹاک مارکیٹ، سٹہ، سود، جیسی چیزیں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے اسٹاک ایکسچینج کو جگہ دی تاکہ بڑے بڑے سرمایہ دار تیزی سے نفع کما سکیں، جس کے اہم اوزار شیئرز، بونڈس اور کرنسیز ہیں۔ آج کی اس دنیا میں انٹرنیٹ کے ذریعے کوئی انسان کہیں بھی انویسٹ کرسکتا ہے، جس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ بحران شروع کسی ایک ملک سے ہوتا ہے مگر آہستہ آہستہ پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے اور پھر ان میں اسٹاک ایکسچینج کے ساتھ بنکس، سٹے دار کا ملوث ہونا اور بھی خطرناک ہوجاتا ہے۔ عام لوگوں کو متاثر کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ ''سود'' ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ ہے اور غریب لوگوں کے استحصال کا سبب ہے۔ ●●

ضرورت رشتہ

دوسگی بہنوں کے لئے جن میں ایک کی عمر ۲۸ سال قد پانچ فٹ چار انچ، تعلیم گریجویٹ گرلز آئی ٹی آئی میں بطور انسٹرکٹر Instructor خدمت انجام دے رہی ہے رنگ قدرے سانولا ہے۔ دوسری کی عمر ۲۴ سال تعلیم بی کام بی اے رنگ صاف دونوں امور خانہ داری میں ماہر اور صوم وصلوٰۃ کی پابند ہیں برسرروزگار لڑکوں سے رشتے مطلوب ہیں۔ دہلی اور این سی آر کے رشتوں کو ترجیح دی جائے گی۔

Box No. 2259
C/o Sehroza Dawat
Dawat Nagar, D-314,
Abul Fazl Enclave,
Delhi-25 Jamia Nagar, New

ملازمت کے متلاشی حضرات متوجہ ہوں

ایکمیوز لمیٹڈ ٹرسٹ، ملازمت تلاش کرنے والے نوجوانوں، لیڈیز اور پکی عمر کے لوگوں کی تلاش روزگار میں صبح ساڑھے دس بجے سے شام پانچ بجے تک رہنمائی کرتا ہے۔ اور تعلیم یافتہ حضرات ہماری ویب سائٹ login4job.com پر بھی رجسٹر کر کے ملازمت سے متعلق معلومات حاصل کرسکتے ہیں، یا ہمارے آفس پر آکر رجسٹریشن کراسکتے ہیں۔

پتہ: ایکمیو ۱۷۹ روزیر بلڈنگ، پہلی منزل، شالیمار ہوٹل کے اوپر، بھینڈی بازار، ممبئی۔ ۳

شہباز فقیہ
23478329

(سی بی ایس ای سے منظور شدہ انگلش میڈیم سینئر سیکنڈری اسکول)

ایم اے ایف اکیڈمی نوئیڈا

(تسلیم شدہ اقلیتی تعلیمی ادارہ)

تیسرے سال سی بی ایس ای بورڈ امتحان میں

دسویں اور بارہویں کے بیشتر طلباء فرسٹ ڈویژن میں پاس

مختلف مضامین میں سب سے زیادہ نمبر حسب ذیل ہیں:

انگلش	91	کرشما چندر بوس	حساب	95	نیہا سریواستو
سوشل اسٹڈیز	93	نیہا شرما	سائنس	94	نیہا شرما
ہندی	93	مونیکا پردھان	سنسکرت	91	کرشما چندر بوس
اُردو	80	سومیہ علی۔ رقیہ محترم			

طلبہ کا اوسط نمبر 74 فیصد

بارہویں جماعت (سائنس) میں سب سے زیادہ نمبر حسب ذیل ہیں:

انگلش	91	ارمان	حساب	95	چھایا	فزکس	93	ارمان
کیمسٹری	95	ارمان	بایولوجی	87	زینب	کمپیوٹر	90	چھایا
فزیکل ایجوکیشن	93	شفیع الدین	اکنامکس	75	بیٹایادو	اردو	82	قیوم

طلبہ کا اوسط نمبر 75 فیصد

بارہویں جماعت (کامرس) میں سب سے زیادہ نمبر حسب ذیل ہیں:

انگلش	92	رسچا	اکنامکس	84	مبشر	بزنس اسٹڈیز	95	یوگیتا
اکاؤنٹس	78	یوگیتا	فزیکل ایجوکیشن	94	زیبا خاں	اردو	70	صائمہ

طلبہ کا اوسط نمبر 74 فیصد

ہر بچہ کچھ کہتا ہے، ایسی لگن کو سلام

اپنے بچے کے تابناک تعلیمی مستقبل کے لئے آپ بھی ایک صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں

XI میں سائنس اور کامرس کلاسوں میں داخلہ شروع

نرسری سے گیارہویں کلاس تک داخلہ کے لئے چند سیٹیں دستیاب

M.A.F. Academy
Senior Secondary School
(An English Medium Minority Institution)
A-43, Sector, 62, NOIDA

Web: mafacademy.com, email:info@mafacademy.com
Phone:+91-120-2400522, +91-120-6545202
Mobile: +91-9810009477

(داخلہ فارم ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے)

قادری دواخانہ کی کامیاب ترین یونانی دوائیں

DIAL
033-2469-3173
033-2489-3539

گٹھیا کے درد میں؟

کسی بھی قسم کے درد چوٹ موچ گٹھیا۔ جلنے کٹنے اور بچوں کی مالش میں بہت ہی مفید ہے۔

زعفرانی تیل

گیسٹک کے درد میں

قبض ٹروجن

بدہضمی، بھوک کی کمی، دردجگر، قبض، سینے کی جلن اور پیٹ کے جملہ امراض میں بہت ہی مفید ہے

Qadri Dawakhana
B-18, NAWAB WAJID ALI SHAH ROAD, KOLKATA - 24,
DISTRIBUTORS:
DARYA BADI DAWAKHANA 393, E. R. Road, Pydhonie, Mumbai - 400 003 Ph: 022-2341-1957,
RELAX ENTERPRISES 3416, Bahishti Wada, No.1, Dhule, - 424 001 Ph: 02562-236952

حکومت سے منظور شدہ ایکسپورٹ ہاؤس

سپر ٹینری لمیٹیڈ

● برنشڈ بف کاف ● فیشن ایبل لیدرز ● اکل پُل اَپ ● انڈسٹریل سیفٹی بوٹ لیدرز ● نو بک ● واٹر پروف لیدرز ● گارمنٹ نپا ● شوانیڈ بوٹ اپرز

SUPER TANNERY LIMITED
(A Government Recognised Export House)
187/170, JAJMAU ROAD, KANPUR-208010 (INDIA)
Tel:+91-512-2460137,2465362,2462138,2461079
Fax:+91-512-2460792,2462227,
Email:supertannery@satyam.net.in
Website:www.supertannery.org

دلت مسئلہ جڑ میں کون؟

☆ دلت مسئلہ جڑ میں کون؟ (اردو وہندی) از انتظار نعیم صفحات: 356 قیمت: 140

☆ दलित समस्या जड7 में कौन? पृष्ठ : 296 मूल्य : 100

''......کبھی آپ نے سوچا؟''

وطن عزیز میں سینکڑوں برسوں سے دبے کچلے طبقات کے لوگوں کو اوپر اٹھانے کی بہت سی کوششوں کے باوجود آج بھی سماج میں چھوا چھوت اور نابرابری پائی جاتی ہے۔ انسان انسان کو حقیر سمجھ رہا ہے۔ آخر اس کے کیا اسباب وعوامل ہیں؟ اور آج کے حالات میں ان مسائل کا حل کیا ہوسکتا ہے؟

دعوت کی خدمت انجام دینے والوں کو اس حقیقت سے ضرور باخبر ہونا چاہیے کہ اس مسئلہ کے پس پردہ کن چیزوں کا ہاتھ ہے۔ یہ سب جاننے اور اپنے دلت بھائیوں کو بھی اس سے آگاہ کرانے کے لیے ''دلت مسئلہ جڑ میں کون؟'' کا مطالعہ ضرور کریں۔

کتاب کی مختصر جھلکیاں

◉ ذات پات کے نظام کی ویدتخلیق ◉ ورن آشرم کے وید کے دور کے خدوخال ◉ اچھوت کیسے بنیں ◉ براہمن گرنتھ اور اُپ نشد میں شودر ◉ گیتا میں ورن ویوستھا کی تائید ◉ گیتا اور مہابھارت میں شودر کی حالت ◉ ذات پات کے حامی تلسی داس ◉ ہندو سماج میں چھوا چھوت ◉ ذات پات کا رواج کیسے وجود میں آیا ◉ ہندتوا کی تاریخ ◉ مندر میں داخلے پر لاٹھیوں سے استقبال ◉ ہندو راشٹر میں دلت ◉ تاریخ گواہ ہے ◉ آزادی میں بھی غلامی کی کیفیت ◉ دلت عورت کی تذلیل ◉ اگست 1956 کا ایک سیاہ دن ◉ ڈاکٹر امبیڈکر نے ہندو دھرم کیوں چھوڑا؟ دیگر اسی طرح کے بہت سے عنوانات۔

کتاب 8 ابواب پر مشتمل جس میں تقریباً 400 عنوانات اور دلت سماج کے نامور مصنفین ودانشوران کے مبارکبادی خطوط شامل اشاعت ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کچھ لوگوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر لگائے گئے الزام ''دلت مسئلہ اسلام کی دین ہے'' کا اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے بہترین جواب۔

دعوتی، اصلاحی، تاریخی واسلامی کتب کے لئے رابطہ کریں، فہرست کتب مفت طلب کریں۔

مدھر سندیش سنگم

E-20، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر 011-26953327, 09212567559
ای میل: madhursandeshsangam@yahoo.co.in

سانپ، اور دیگر بھی زہریلے، جانوروں کے کاٹے ہوئے اور پرانے مشکل مریضوں کا ہومیو پیتھک علاج

سفید داغ کا 100% علاج

ڈاکٹر سہیل اعظمی

پھول پور، اعظم گڑھ (یوپی) Mob. 09839569496

نوٹ: فالج، لیکوریا اور ہائی بلڈ پریشر کا علاج

کلیاتِ حفیظ

از: حفیظ میرٹھی

تحریک اسلامی کے ہردل عزیز شاعر حضرت حفیظ میرٹھی کی

● محبتِ رسول ﷺ سے سرشار کرنے والی نعتوں،
● صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تعلق و وابستگی پیدا کرنے والی منقبتوں،
● قاری کو آفاقی پیغام دینے والی فکر انگیز غزلوں،
● بصیرت افروز نظموں

اور

● بعض دوستوں کے اصرار پر کہے گئے سہروں اور الوداعی نگارشوں کا دل کش مجموعہ۔

واضح رہے کہ ''کلیات حفیظ'' میں حفیظ میرٹھی کے دونوں شعری مجموعوں (شعر وشعور اور متاع آخر شب) کو بھی شامل کیا گیا ہے اور ان تمام دریافت شدہ شعری تخلیقات کو بھی جو کسی وجہ سے اِن مجموعوں میں نہیں شامل ہوسکیں۔

سائز: ۲۳x۳۶/۱۶ ☆ صفحات: ۲۴۰ ☆ قیمت: -/Rs.150

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

P.O. Box No. 9752, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Ph: 26954341, 26971652 Fax : 26950975, 26947858
E-Mail : mmipublishers@gmail.com Website:www.mmipublishers.ne